Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آئینہ نما

Collected Essays of
Shamim Ahmed Shamim

Edited By
Qurat-ul-Ain

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

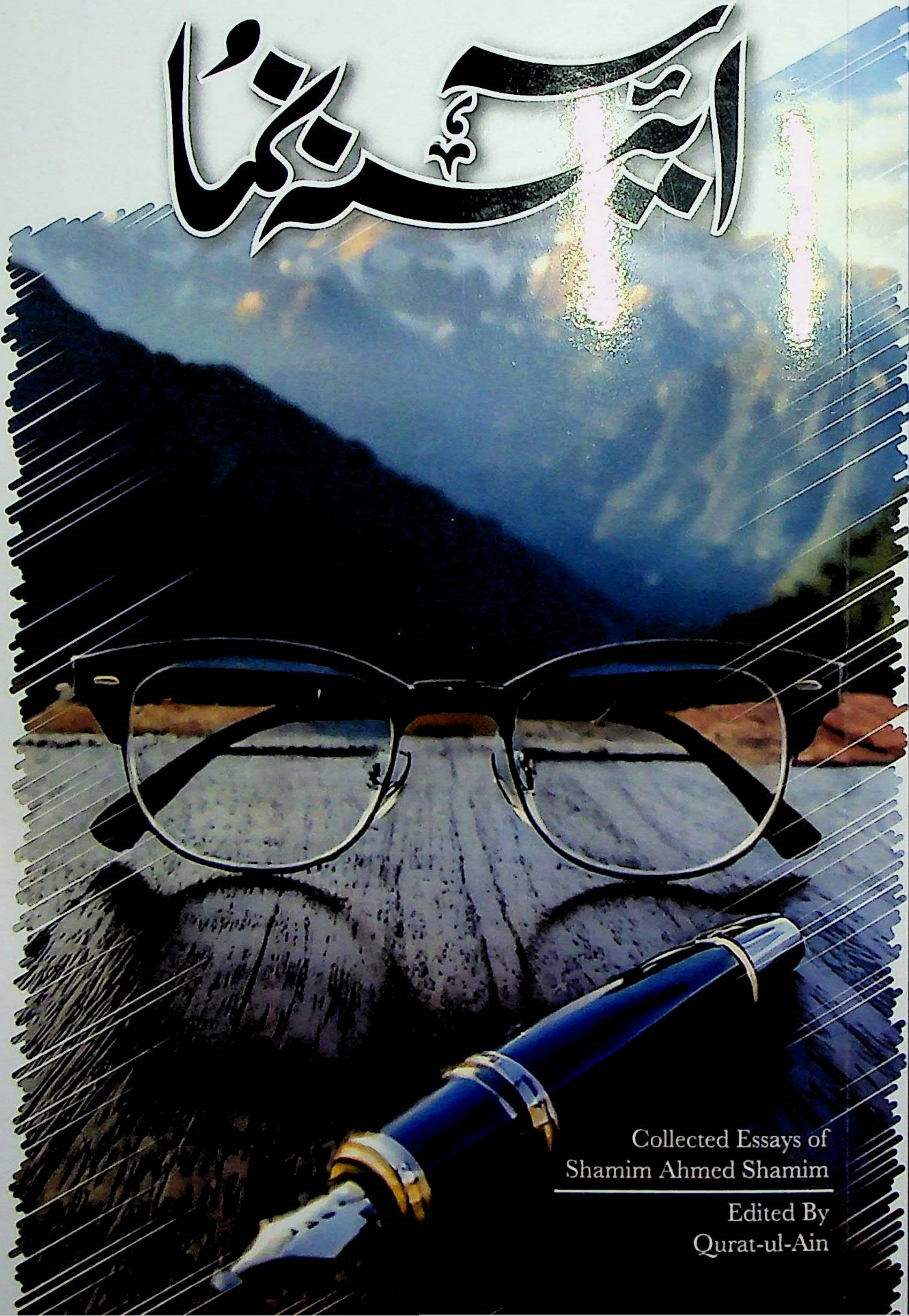

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آئینہ نما

(۱۳)

مرتب

قرۃ العین

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

® جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : آئینہ نما (شمارہ:۱۳)

مرتب : قرۃ العین

پتہ : باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئنٹ ہسپتال

برزلہ سرینگر

فون: 2433795 / 9419015745

کمپیوٹر کمپوزنگ : عادل اسماعیل (7006356341#)

سرورق : جہاد ظفر شورا

سال اشاعت : 2025ء

قیمت : عام ایڈیشن: -/400

لائبریری ایڈیشن: -/500

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

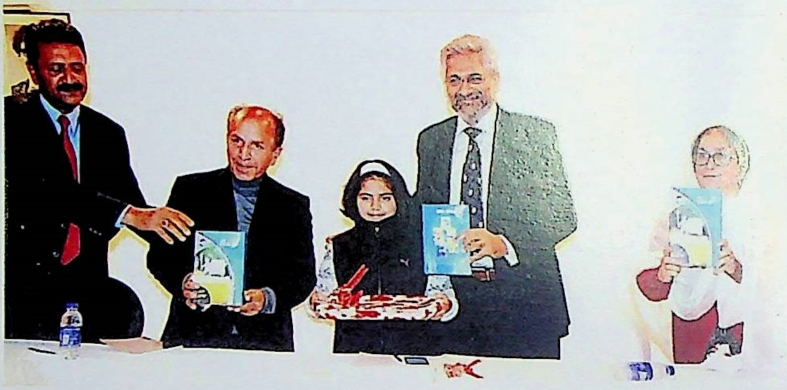

ممتاز صحافی سدھارتھ وردراجن آئینہ نما کا اجراء کرتے ہوئے

دانشور صحافی اعجاز الحق سامعین سے خطاب کرتے ہوئے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

صفِ سامعین

قرۃ العین اور عزین شمیم معراج پارمو

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	اپنی بات............قرۃ العین	۷
	اداریے	
۲	شیخ صاحب اور الحاق	۱۲
۳	مسز گاندھی اور مسلمان	۱۷
۴	قاسم صاحب کے چھ ماہ	۲۵
۵	شیخ محمد عبداللہ اور کشمیر	۳۱
۶	مِسز گاندھی کیلئے لمحہ فکریہ	۳۶
۷	کانگریسی فیشن پَریڈ	۴۱
۸	کارِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد	۴۵
۹	ذُوالفقار علی بھٹو	۵۲
۱۰	قاسم صَاحِب کی مَساعیٔ جمیلہ	۵۸
۱۱	خوش فہمیاں غلط فہمیاں	۶۴
۱۲	مِسز گاندھی کی قیادت	۷۱

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

۱۳	درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا	۷۸
۱۴	ندامت یا گھبراہٹ	۸۲
۱۵	غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر۔۔۔	۸۶
۱۶	نئے حقائق، نئے تقاضے	۹۲
۱۷	بیگ پارتھا سارتھی بات چیت کی ناکامی	۹۸
۱۸	پھر آگیا ہوں گردشِ دوراں کو ٹال کر	۱۰۴
۱۹	مسئلہ کشمیر۔۔۔میری نظر میں	۱۱۰
۲۰	یہ نفسا نفسی کا عالم	۱۱۸
۲۱	مسز گاندھی اور عدلیہ	۱۲۱
۲۲	قیامت صغریٰ	۱۲۸

تیسرا صفحہ

چراغ بیگ کے قلم سے

۲۳	رقابت سے قُربت تک	۱۳۴
۲۴	تین ملاؤں میں مرغی حلال	۱۴۰
۲۵	قُریشی صاحب کا معافی نامہ	۱۴۳
۲۶	محکمۂ سیاحت کے لئے لمحۂ فکریہ!	۱۵۱
۲۷	شکایت کا فقدان	۱۵۴
۲۸	ہندو اکثریت کو خطرہ	۱۵۷
۲۹	گرم روی سے نرم روی تک	۱۵۹

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

۳۰	بے وقت موت	۱۶۳
۳۱	آلو اور گولی	۱۶۸
۳۲	زوال و عروج کی کہانی	۱۷۰
۳۳	☆..................	۱۷۹
۳۴	سیف الدین قاری کے نام	۱۸۵
۳۵	جے پرکاش نرائن کے نام!	۱۸۹
۳۶	چراغ بیگ کی ڈائری	۱۹۳
۳۷	دلیپ کمار سے مُلاقات	۱۹۶
۳۸	شکیلہ بانو بھوپالی	۱۹۹
۳۹	شکریہ! مگر شانِ نزول کیا ہے	۲۰۲
۴۰	تبصرہ اور تنقید	۲۰۵
۴۱	ضرورت ہے۔ دشنام طرازوں کی	۲۰۶
۴۲	پیر صاحب کی کرامت	۲۰۹
۴۳	شِکوہ اور جوابِ شِکوہ	۲۱۷
۴۴	اِنتقالِ پُر ملال	۲۲۲
۴۵	بینگن کے پُجاری	۲۲۶
۴۶	کہ درویشی بھی عیاری ہے سُلطانی بھی عیاری	۲۳۰
۴۷	موسیٰ خان اور کپاس	۲۳۲
۴۸	آخری ملاقات	۲۳۸

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

۴۹	نائب وزیر کی نائب تحصیلداری	۲۴۷
۵۰	اتھواجن کا مرغی خانہ	۲۵۷

ایڈیٹر کی ڈائری

۵۱	جنگی قیدی-دردِ سر!	۲۶۲
۵۲	ایشیاء۲۷ء	۲۶۴
۵۳	شیخ صاحب کے شب وروز	۲۶۶
۵۴	پروفیسر مدھوک کی خانہ ساز تاریخ	۲۶۸
۵۵	مرکزی حکومت صرف تشدد، توڑ پھوڑ اور تخریب کی زبان سمجھتی ہے	۲۷۱
۵۶	مولوی نورالدّین کا معمہ	۲۷۷
۵۷	حوصلہ افزا اور باعثِ اطمینان	۲۷۹
۵۸	عاشقانِ پاکستان کی خدمت میں	۲۸۱
۵۹	جائیدادِ مہاجرین کے غاصب	۲۸۸

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اپنی بات

'آئینہ نما' کے قارئین کی خدمت میں میرا خلوص بھرا آداب۔ آج پورے چھ سال بعد آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ ہماری آخری ملاقات 2018ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ حالات نے ایسی کروٹ لی کہ تمام رابطے منقطع ہو گئے اور اس کی گردش کی لپیٹ میں آ کر ہم ایک دوسرے سے بے خبر اور کٹ کے رہ گئے۔ سیاسی اتھل پتھل اور کووڈ کی تباہ کاریوں نے دوسروں سے تو کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا۔ سبھی لوگ گھروں میں اسیر ہو کے رہ گئے اور بے بسی کی حالت میں حالات کے سُدھرنے کا انتظار کرنے لگے۔

بہر حال زندگی نشیب فراز کا دوسرا نام ہے اور صورت حال کتنی بھی مخدوش اور سنگین ہو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی اور انسانی فطرت بھی اس سے مفاہمت اور سمجھوتہ کر کے زندگی کو آگے بڑھانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔

رفتہ رفتہ حالات سے سمجھوتہ ناگزیر بن گیا، زندگی کی رفتار میں قدرے ٹھہراؤ سا آیا۔ آئینہ نما کے تعلق سے ذہنی جمود بھی ٹوٹ گیا اور میں نے ادھورے کام کو پورا کرنے کا ارادہ پکا کر لیا۔ اور آج آئینہ نما کے تیرھویں شمارے کو آپ کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔

یہ شمارہ اس دور کی تاریخ پر مشتمل ہے جب شمیم صاحب 1971ء میں پارلیمانی الیکشن جیت چکے تھے اور وہ سرینگر سے دلی شفٹ کر چکے تھے۔ پارلیمنٹ میں ان کی گوناں گو مصروفیتوں کے پیش نظر کسی حد تک آئینہ کے تئیں ان کی ذمہ داریاں اثر انداز ہو چکی تھیں۔ اس بات کا انہیں احساس تھا اور وہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ''میرے لئے دلی میں رہ کر آئینہ کی ترتیب و تدوین کا کام ناممکن بن گیا۔ میں نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنے آپکو اس ذہنی صدمے کے لئے تیار کر لیا کہ اب آئینہ کا اجراء میرے بس کی بات نہیں اور باقاعدہ طور پر اعلان کئے بغیر آئینہ کو تقریباً بند کر دیا۔'' لیکن آئینہ کی مستقل جدائی کو گوارا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور آئینہ کے سینکڑوں پرستاروں نے بھی ان کے اس فیصلے کو منظور نہیں کیا۔ آخرکار انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور یہ کہہ کر آئینہ کو پھر سے اپنا لیا۔

''میں نے اپنی سہولت اور عافیت کے لئے ایک عظیم مقصد اور نصب العین سے غداری کی تھی۔ میں نے 'آئینہ' کو بند کر کے ایک ذہنی انقلاب کے امکانات کو ختم کر دیا تھا۔ میں آئینہ کے ان سینکڑوں پرستاروں کا ممنون ہوں کہ جنہوں نے مجھے اس جرم اور محرومی کا احساس دلایا۔ میں آئینہ کے اس احیاء نو کو ان ہی آئینہ نوازوں کے نام ممنون کرتا ہوں۔''

وہ جتنی دیر پارلیمنٹ کے ممبر رہے آئینہ کی باقاعدہ اشاعت کو بھی جاری رکھا اور ساتھ ساتھ کشمیر اور کشمیری عوام کی ترجمانی کا بھرپور طریقے سے حق ادا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کیا۔ وہ سارے عرصے کے دوران ہندوستانی حکمرانوں سے کشمیری عوام کے ساتھ کی گئی عہد شکنی، حق تلفی اور زیادتیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے اور ہر مرحلے پر انہیں اس بات کا احساس دلاتے رہے کہ وہ کشمیری عوام کے مجرم ہیں اور وہ ان کے ساتھ کیئے گئے ناروا سلوک اور وعدہ خلافی کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ انہیں اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ جب بھی پارلیمنٹ میں دفعہ 370 کو ختم کرنے کا بل پیش ہوا ہے جموں وکشمیر کے ممبران پارلیمنٹ نے ہمیشہ اس کی پُرزور حمایت کی ہے۔ بادشاہ سے زیادہ ان وفادار نمائندوں نے ریاستی عوام کے جذبات و احساسات اور ان کے وسیع تر مفادات کو نظر انداز کر کے صرف اپنا اعتبار بڑھانے کے لئے اس کی منسوخی کے مطالبے کی حمایت کی ہے۔ اور اپنی لچھے دار تقریروں سے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ کشمیر کے عوام اپنی اس ''خصوصی حیثیت'' سے نالاں اور پریشاں ہیں۔ اس دفعہ کی پُرزور حمایت اور وکالت کی پاداش میں انہیں پاکستانی ایجنٹ اور غدارِ ملک قرار دیا گیا۔

اگرچہ ایک طرف پارلیمنٹ میں کشمیر اور کشمیر کے دفاع میں انہوں نے سارے ملک سے جنگ چھیڑ رکھی تھی لیکن انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ کشمیر میں 'پاکستانی جنت' کا خواب اسقدر مضبوط اور دلفریب ہے کہ تمام مسائل، مشکلات اور ناممکن حالات کے باوجود عوام اس حسین خواب کی تکمیل کی چاہت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں اور انہیں اس بات کی پوری اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ خواب پایۂ تکمیل کو پہونچے گا۔

'عاشقانِ پاکستان کی خدمت میں' کے عنوان سے اہلِ کشمیر کو اس

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

'سُراب' سے پیچھا چھڑانے اور سنگین حقائق کا سامنا کرنے کی بڑی مدلل اور متاثر کن اپیل کی ہے۔ ان کا یہ خط ان کی فہم و فراست، سیاسی تدبر، ذہنی پختگی، حقیقت پسندی، دور اندیشی کی شاندار مثال ہے۔

اس شمارے میں کشمیر کے علاوہ پارلیمنٹ میں چھ سالہ مدت کی قومی سطح کی سیاست کا احاطہ بھی شامل ہے۔ مسز گاندھی کی قیادت کے ساتھ معرکہ خیز بحث و مباحثے، ہندو فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے ساتھ زوردار مقابلہ آرائی اور الزامات و جوابی الزامات کی پوری داستان ہے۔ بقول شمیم صاحب یہ ان کی زندگی کا بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔

Illustrated Weekly کے ایڈیٹر خشونت سنگھ کا کہنا تھا کہ انہیں موجودہ پارلیمنٹ میں ابھی تک ایک بار بھی کوئی فکر انگیز یا دلچسپ بحث سننے یا پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جن دوستوں کو پارلیمانی پریس گیلری میں بیٹھنے کا موقعہ ملا ہے ان کا کہنا ہے کہ نئی پارلیمنٹ میں صرف تین مقرروں نے اپنا لوہا منوالیا ہے: انگریزی میں پیلو مودی، ہندی میں اٹل بہاری واجپائی اور اُردو میں شمیم احمد شمیم نے۔

مجھے اُمید ہے یہ شمارہ آپکی توقعات کو پورا کرے گا۔

ایک بات اور آئینہ نما کے چودھویں شمارے کی ترتیب کا کام شروع کر چکی ہوں۔ انشاء اللہ خدا کی مرضی اور آپکی دعائیں شامل حال رہیں تو اگلی دفعہ پھر ملاقات ہوگی۔

آپ کی رائے کی منتظر

قرۃ العین

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اداریے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شیخ صاحب اور الحاق

جو لوگ شیخ محمد عبداللہ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ سولہ ماہ کی جلاوطنی کے بعد کشمیر لوٹ کر اپنے نئے سیاسی موقف کا اعلان کریں گے۔ انہیں حضوری باغ کے جلسہ عام میں اِن کی تقریر سُن کر مایوسی ہوئی ہوگی اور جو عقیدت منداِس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ شیخ صاحب بدلے ہوئے حالات کے باوجود اپنی جگہ پر ڈٹے رہیں گے اُنہیں بھی خاصی مایوسی ہوئی ہوگی۔ جلاوطنی کے بعد عوامی اجتماع میں اِن کی یہ پہلی تقریر جہاں اپنے بنُیادی موقف سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہے، وہاں ان کے بدلے ہوئے موڈ اور نئی سوچ کی بھی غماز ہے۔ سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بغیر کسی جرم کے سولہ ماہ کی سزا بھگتنے کے باوجود اِن کے لہجے میں کسی قسم کی تلخی یا بیزاری کا احساس نہیں تھا اور اپنی ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر میں اُنہوں نے اپنی جلاوطنی کا ذکر تک نہ کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ماضی کا پوسٹ مارٹم کرنے کی بجائے مستقبل کے خاکوں میں رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ریاستی عوام کے لئے ایک نیک شگون ہے!

شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں قدرے تفصیل کے ساتھ کشمیر کی تحریکِ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آزادی کے آغاز اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی، تاکہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے اِس ذہنی اور فِکری الحاق کا پسِ منظر سمجھ میں آئے کہ جس کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے پہلے شروع ہوتی ہے اُنہوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے حکمران پسند اور عوام دشمنانہ رویے کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے آئینی الحاق کا تاریخی جواز بھی مدلل طریقے پر بیان کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت پر یہ الزام عائد کیا کہ اِس نے کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے فوراً بعد ان اصولوں اور آدرشوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ کہ جن کی بُنیاد پر کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑا تھا۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ کہ جو شیخ صاحب آج سترہ برس سے وقتاً فوقتاً دُہراتے آئے ہیں۔ لیکن آج کے پس منظر میں اِن باتوں کو ایک نئی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ برصغیر میں بدلے ہوئے سیاسی حالات اور طاقت کے توازن نے سوچ اور سمجھ کے پُرانے پیمانے بدل دیئے ہیں۔ بنگلہ دیش کے قایم ہو جانے سے بعض مفروضے غلط اور کچھ اندازے صحیح ثابت ہوئے ہیں جہاں مذہب کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا تاریخی افسانہ ایک جھوٹا طلسم ثابت ہو کر ٹوٹ گیا ہے۔ وہاں عوامی طاقت اور جمہوری اقدار کی نا قابلِ تردید حقیقت نے اپنے وجود کو منوا لیا ہے۔ حقائق کے تصادم اور تاریخی قوتوں کے ٹکراؤ نے کچھ نئی حقیقتوں کو جنم دیا ہے۔ اور قدرتی طور شیخ محمد عبداللہ کا ذہن، شعوری اور غیر شعوری طور پر، اِن سے متاثر ہوا ہے، وہ اگرچہ اپنے بنیادی موقف پر آج بھی قایم نظر آتے ہیں۔ لیکن اس موقف کی تشریح و توضیح میں وہ اب ایک نیا لب ولہجہ ہی نہیں، ایک نیا ڈکشن بھی استعمال کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے الحاق کی دستاویز کو

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

الحاق کی بنیاد قرار دے کر اِس اصول کو تسلیم کر لیا ہے، کہ ہندوستان اور کشمیر کے درمیان ایک پائدار تعلق اور رشتے کی اساس موجود ہے۔ اِن کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر کو جو خصوصی حیثیت دِی گئی تھی اور جسے ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۷۰ میں آئینی درجہ دیا گیا تھا۔ وہ اِس جذباتی اور کمزور الحاق کو زیادہ مستحکم بنا سکتی تھی کہ جس کے حصّول کیلئے ہندوستان کی حکومت نے پولیس اور فوج کو استعمال کیا۔ انہیں شکایت ہے کہ الحاق کو کمزور کرنے کی اصل ذمہ داری حکومتِ ہند پر عائد ہوتی ہے۔ اور اِسے اخلاقی، فکری اور نظریاتی بنیادوں پر دوبارہ منظم اور مستحکم کرنے کی ذمہ داری بھی اِسی کو سنبھالنا پڑے گی۔ لیکن انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ گذشتہ سترہ اٹھارہ برسوں میں کشمیری عوام کے ساتھ اتنی زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوئی ہیں۔ کہ آج انہیں ہندوستانی لیڈروں کے خلوص اور اِن کی نیک نیتی کا یقین دِلانا انتہائی مشکل کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نظریاتی کش مکش کی بجائے ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ ایک بار دھوکا کھانے کے بعد دوسری بار فریب نہیں کھانا چاہتے! لیکن اِس کے باوجود اُنہوں نے حکومتِ ہند کو یہ پیش کش کی ہے کہ اگر وہ ۱۹۴۷ء کی بنیادُوں پر واپس جانے کے لئے تیار ہے تو بامعنی گفتگو اور بامقصد مفاہمت کے دروازے کھُل سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں شیخ صاحب کے لئے اس سے زیادہ کی پیش کش کرنا ممکن بھی نہیں۔ اور اگر حکومت ہند دیانتداری کے ساتھ کشمیر کے سوال کو باعزت طریقے پر حل کرنا چاہتی ہے تو انہیں اِس پیش کش کو قبول کر کے کشمیری عوام کے شبہات اور خدشات کو دُور کرنا چاہیئے۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شیخ صاحب کی اِس دلیل میں بڑا وزن ہے کہ انہیں ۱۹۵۳ء کے بعد کی تبدیلیوں کی تصدیق کے لئے صرف اِس لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اگست ۱۹۵۳ء کی مجرمانہ کاروائی صرف ان کی ذات ہی کے خلاف نہیں، کشمیری عوام کی عزّت وآبرو اور جمہوری اداروں کے خلاف بھی کی گئی تھی۔ اوراس کے بعد جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سیاسی قاتلوں اور اخلاقی مجرموں کی سازش کے سوا کچھ نہیں اوراس کی آئینی حیثیت جو بھی ہو، اخلاقی حیثیت بہر حال مشکوک رہے گی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ۱۹۵۳ء کے بعد کشمیری عوام کو کِتنے فائدے اور کِتنی مراعات حاصل ہوئی ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ ریاست کی اندرونی خودمختاری کے تصوّر اور جمہوری اقدار کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ افراد ہی کی طرح قومیں صرف فائدوں اور مراعات پر ہی زندہ نہیں رہتیں۔ بلکہ سیاسی اور اخلاقی تقاضوں کے احترام کو بھی ان کے نشوونما میں عمل دخل رہتا ہے۔ چرس اور گھانجے کا کاروبار بے حد منفعت بخش ہونے کے باوجود قانونی طور پر ممنوع ہے۔

حضوری باغ میں شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات کی تصدیق کرلی ہے کہ ان کے اور وزیراعظم مِسز گاندھی کے درمیان بات چیت کے بعد باہمی گفت وشنید کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ ایک نہایت ہی مبارک خبر ہے اوراس سے بجا طور پر کچھ اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ کیوں کہ مکالمے کی عدم موجودگی میں اِن افواہوں اور افسانوں کو فروغ ملتا ہے کہ جن سے مفاہمت اور مصالحت کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنی تقریر کے آخر میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کی بنیاد فریقین کے درمیان بات چیت کا نکتۂ آغاز بن سکتی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے کچھ مبہم انداز میں معاہدوں کی ضمانت اور سمجھوتوں کی حرمت کی بات بھی کی ہے۔ اِس سے غالبًا ان کا مقصد ریاست کی اندرونی خودمختاری کے لئے کُچھ آئینی اور معاہداتی تحفظات سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مطالبہ جذباتی تسکین کا سامان تو ہوسکتا ہے۔ نیک نیتی، باہمی اعتماد اور اخلاص کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ کوئی آئینی ضمانت یا معاہدہ اتنا پائیدار اور مستحکم نہیں ہو سکتا کہ جسے طاقت اور زور زبردستی سے پامال نہ کیا جاسکے۔ اصل ضمانت ملک کی رائے عامہ اور جمہوری اداروں کا استحکام ہے اور شیخ صاحب کو کشمیر کی اندرونی خود مختاری کو بحال کرنے کی جدوجہد میں پُورے ملک کی رائے عامہ کو ہموار کرنا پڑے گا۔ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن اس کے بغیر کامیابی کی کوئی صورت نہیں اور اگر ہمیں ملک کے عوام کی تائید حاصل نہ ہو، تو سرکاری طور پر دِی گئی ہزاروں ضمانتیں بھی ہماری اندرونی خودمختاری کو محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ اِس لئے آئینی ضمانتوں سے زیادہ ہمیں عوامی ضمانت کے حصّول پر اپنی توجہ صرف کرنا ہوگی!

......☆......

(۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسز گاندھی اور مسلمان

ملک کی تقسیم نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جو سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل پیدا کر دئے ہیں، وہ گزشتہ پچیس چھبیس برسوں میں سلجھنے کی بجائے اُلجھتے جا رہے ہیں۔ آج جب سرکاری سطح پر آزادی کی پچیسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان سیاسی ابتری، اقتصادی پسماندگی اور احساس کمتری کے ایک ایسے بھنور میں پھنسا ہوا ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے تنکوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ گزشتہ بیس بائیس برسوں میں حکمران جماعت نے مسلمانوں کی بے بسی اور بے کسی کا فائدہ اٹھا کر ہر انتخاب میں ان کی حمایت اور ان کا تعاون حاصل کیا۔ فرقہ پرست جماعتوں کے مسلم کُش پروپاگنڈا سے فائدہ اُٹھا کر حکمران جماعت نے مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی، کہ ان کی نجات اور تحفظ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ کانگریس کے ہاتھ مضبوط کریں، ہر انتخاب کے وقت مسلمانوں کو وعدوں کے کھلونوں سے بہلا کر ان کا ووٹ حاصل کیا گیا اور ہر انتخاب کے بعد انہیں فرقہ پرستوں کی سازش اور یلغار سے ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا گیا۔ مسلمان مجبور تھا، اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بھی نہیں تھا، اس لئے وہ جان بوجھ کر دھوکا کھاتا رہا، ایفائے عہد کرتا رہا۔ ۱۹۶۹ء میں حکمران جماعت میں پھوٹ پڑنے کے بعد مسز اندرا گاندھی مسلمانوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئیں، کہ وہ ان کی محافظ، نجات دہندہ، ہمدرد اور غم خوار ہے اور اس تاریخی کشمکش میں اس کی کامیابی مسلمانوں کے لئے ایک خوشگوار اور خوشگوار دور کا آغاز ہوگی۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا، کہ جب مسلمانوں کی حمایت اور ان کے تعاون کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے کے بجائے حکمران جماعت نے اس کے حصول کے لئے بڑی محنت اور جدوجہد کی اور ہندوستانی مسلمانوں ن نے بجا طور پر مسز گاندھی کو اپنا اعتماد اور اعتبار بخش دیا۔

۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات اور ۱۹۷۲ء کے اسمبلی انتخابات میں مسز گاندھی کی فتح بہت حد تک اس اعتماد و اعتبار کی مرہون منت ہے۔ بہت دنوں کی آوارگی اور درماندگی کے بعد مسلمانوں کو یہ احساس ہوگیا کہ مسز اندرا گاندھی کے روپ میں ایک مسیحا ظاہر ہوا ہے، کہ جو اِن کے زخموں کا مرہم اور ان کے دکھ درد کا مداوا ثابت ہوگا۔ حق یہ ہے کہ مسز گاندھی کی روایات سیکولرازم سے ان کی گہری وابستگی اور مسلمانوں کے تئیں ان کی ہمدردانہ روش نے انہیں مسلمانوں کا ہی نہیں، تمام اقلیتوں کا اعتماد بخش دیا اور وہ اپنے باپ جواہر لال نہرو سے بھی بڑھ کر سیکولر آدرشوں کی علامت بن گئیں، ہندوستانی مسلمانوں کو خاص طور پر ایک آسرا مل گیا۔ اور مسز گاندھی ان کے لئے امید، اعتماد اور توقعات کا مرکز بن گئیں!۔

لیکن یہ طلسم ٹوٹتے زیادہ دیر نہیں لگی۔ مسز گاندھی نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہی 'ترقی پسندی' کے نام پر عام مسلمانوں کے جذبات اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

احساسات کونظر انداز کرنا شروع کر دیا اور بد قسمتی سے انہیں کچھ ایسے خوشامد پسند، چاپلوس اور ناعاقبت اندیش مسلمان بھی مل گئے، کہ جن کا سیاسی وجود قبول عام کی بجائے مسز گاندھی کی نگاہِ کرم کا مرہونِ منت ہے۔ ان بدبختوں نے ملک، قوم اور ملّت کے مفادات سے غداری کر کے مسز گاندھی کو اس درجہ گمراہ کر دیا، کہ وہ قدم قدم پر مسلمانوں کے اعتماد اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے لگیں۔ اُردو کے تئیں حکومت کے رویے سے مسلمانوں میں ہی نہیں، صحیح سوچنے والے ہندوؤں میں بھی بدظنی اور بدگمانی پائی جاتی ہے اور اس کے اصل علاقے؛ یو۔پی میں اِس زبان کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے، اس سے بجا طور پر اِس شُبہ کو تقویت پہنچتی ہے، کہ اردو کے معاملے میں حکومت کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ اُردو ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک قدر، ایک نظریے کا نام بھی ہے اور گزشتہ پچیس برسوں میں اِس زبان اور اس تہذیب کو جس بری طرح پامال کیا گیا ہے، اس نے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے متعلق اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا ہے، اردو کے بعد مسلمانوں کی سیاسی، ذہنی اور ثقافتی زندگی میں جو اہمیت اور اولیت علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو حاصل ہے، اس سے مسز گاندھی اور انکے سبھی ساتھی اچھی طرح واقف ہیں۔ غلط یا صحیح، ہندوستانی مسلمان اس تعلیمی ادارے کو اپنے سیاسی وجود، اپنی فکری شخصیت اور ذہنی تربیت کے لئے ایک اہم اور تاریخی مرکز سمجھتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جب مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا اور ان کی قیادت مفلوج ہوگئی۔ تو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ان کے لئے ایک مرکز بن گئی کہ جوان کے مستقبل کی ضمانت ثابت ہوسکتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی ابتری اور زبوں حالی کو دیکھ کر ہی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سر سید نے مسلمانوں کی ذہنی اور فکری تربیت کا خواب دیکھا تھا۔علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اِس خواب کی تعبیر ہے اور اس وقت جبکہ ہندوستان کا مسلمان تعلیمی پسماندگی، سیاسی بحران اور اقتصادی بدحالی کے ایک ایسے ہی دور سے گزر رہا ہے کہ جس نے علی گڈھ تحریک کو جنم دیا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس تعلیمی ادارے سے جذباتی وابستگی قابل فہم بھی ہے، اور کسی حد تک قابلِ قدر بھی۔ لیکن مسز گاندھی اور ان کی حکومت نے جس بے دردی اور بے رحمی سے اس جذباتی اور تاریخی تعلق کو نظر انداز کر کے گزشتہ سال علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کو پارلیمنٹ میں اپنی بھاری اکثریت کے بل بوتے پر پاس کرا دیا، اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں کھُل گئیں اور انہیں اندازہ ہو گیا، کہ اُن کی حمایت، اُن کے تعاون اور ان کے اعتبار کی اصل قیمت کیا ہے۔ پارلیمنٹ میں حزب مخالف کی سخت مخالفت کے باوجود علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کو جس عجلت اور برق رفتاری کے ساتھ پاس کیا گیا، وہ ہندوستان کی پارلیمانی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے۔ بل پاس ہونے کے آخری لمحات تک وزیر تعلیم پروفیسر نور الحسن کی طرف سے ترامیم پیش ہوتی رہیں اور آخر میں وہپ جاری کر کے بل پاس کرایا گیا۔ حکمران جماعت میں جو لوگ اس زیادتی اور ناانصافی کے خلاف تھے، انہیں زبردستی خاموش کرا دیا گیا۔ کابینہ میں مسلمانوں کے نام پر روٹیاں توڑنے والے وزراء اس غیر جمہوری اور آمرانہ قانون کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے مسز گاندھی کی ترقی پسندی کی داد دیتے رہے۔ اور اس طرح ہندوستانی مسلمان کے جذبات کا آبگینہ چکنا چور ہو گیا۔ میں خود علی گڈھ کے موجودہ ماحول سے مطمئن نہیں ہوں۔ اِس تعلیمی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ادارے میں بہت سی ایسی بُرائیاں پیدا ہوگئی ہیں، کہ جنہیں دور کرنا خود مسلمانوں کے مفادات کے لئے بے حد ضروری ہے۔ یہ ادارہ مسلمانوں کو ذہنی، فکری اور سیاسی قیادت مہیا کرنے کے لئے قائم ہوا تھا، لیکن آج اس کے سوتے خشک ہو چکے ہیں اور علی گڈھ ایک فعال، متحرک اور جاندار تہذیبی تحریک کی بجائے محض ایک علامت بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن یہ کام اس کی اندرونی خود مختاری، اس کے بنیادی کردار، اور اس کی تاریخی اہمیت کو ختم کر کے انجام نہیں دیا جا سکتا۔ افسوس کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی شکل میں یہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس سے مسلمانانِ ہند بجا طور پر ناراض ہو کر بغاوت پر اُتر آئے ہیں۔ وہ مسز گاندھی اور ان کی حکومت سے سارے رشتے ٹوڑ کر نئی مفاہمتوں اور نئے ساتھیوں کی تلاش میں نکلے ہیں۔ یو پی اسمبلی کے آنے والے انتخابات نے انہیں اپنی طاقت اور ناراضگی اظہار کرنے کا ایک بہت اچھا موقع فراہم کر دیا ہے اور مخالف جماعتوں نے مسلمانوں کی اس نفسیاتی کیفیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی حکمتِ عملی منظّم کی ہے۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف دہلی میں منعقدہ حالیہ کنونشن میں سوتنتر پارٹی، کانگریس آرگنائیزیشن، بی کے ڈی اور ایس ایس پی کے لیڈروں کی شمولیت اِس حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔

ہندوستان کا مسلمان حکمران کانگریس سے بالعموم اور مسز اندرا گاندھی سے بالخصوص مایوس ہو کر آج اگر جن سنگھ، کانگریس آرگنائیزیش، اور سوتنتر پارٹی جیسی رجعت پسند جماعتوں سے آس لگا بیٹھا ہے، تو اس کی اصل ذمہ دار مسز گاندھی ہیں، کہ جس نے ان کے جذبات اور ان کے احساسات کو پاؤں تلے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

روند کر اسے اپنی بے کسی اور بے بسی کا احساس دلایا ہے۔ یونیورسٹیوں کو نئے نظام اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا بہت ضروری ہے، لیکن اقلیتوں کے جذبات، ان کے جائز حقوق اور اِن میں تحفظ کا احساس پیدا کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیا مسز گاندھی کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ علی گڈھ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں، مسلمانوں کی فکری اور جذباتی وابستگی کا مرکز بھی ہے۔ ''غریبی ہٹاؤ'' سے متعلق سب کام چھوڑ کر وہ اور ان کے ''ترقی پسند'' مشیر علی گڈھ کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟ کیا ملک میں سوشلزم لانے کے لئے اب صرف یہی ایک کام باقی رہ گیا تھا۔؟

مسلمانوں کی بیزاری، بدظنی اور برہمی دیکھ کر اب حکمرانوں کے ذہن میں بھی یہ بات گھر کرنے لگی ہے کہ انہوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ سب سے بڑا مذاق کیا ہے۔ اور اب بہت دنوں کے بعد ملک کے اخبارات میں اِس بات کا چرچا ہونے لگا ہے، کہ کابینہ میں اس مسئلے پر اختلاف پیدا ہو گئے ہیں اور کچھ مسلمان وزیر ایکٹ میں ترامیم کر کے اسے زیادہ جمہوری اور منصفانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر زیڈ احمد، کرنل بشیر حسین زیدی، اور دوسرے ممتاز مسلمان کانگریسی لیڈر بھی مسز گاندھی سے مل کر ان پر یہ واضح کر چکے ہیں کہ علی گڈھ ایکٹ کی بعض دفعات قابلِ اعتراض اور غیر جمہوری ہیں۔ مسلمانوں کے یہ ہمدرد، یہ غم خوار اسوقت کہاں تھے، کہ جب پارلیمنٹ میں طوفان کی سی تیزی کے ساتھ اس بل کو پاس کیا جا رہا تھا، وہ اس وقت کیوں خاموش تھے، کہ جب مخالف

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جماعتوں نے اس غیر جمہوری رویے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ بل پاس ہونے کے چند ہی دن بعد ان ''سرکردہ مسلمانوں'' نے اس بل کی تائید اور حمایت میں ایک عدد بیان جاری کرتے ہوئے ان تمام لوگوں کو رجعت پسند قرار دیا تھا، کہ جو اس بل کی مخالفت کرتے تھے۔ آج اگر حکمران کانگریس کے مسلمان وزیروں اور سرکردہ کانگریسی اور کمیونسٹ مسلمانوں کا ضمیر جاگا ہے، تو اس کے بھی سیاسی اسباب ہیں اور یہ اسباب ہیں، مسلمانوں کا کانگریس کے خلاف منظّم ہونا، اور یو پی کے آئندہ انتخابات میں کانگریس کے خلاف ووٹ دینے کا اندیشہ۔ آج مسز گاندھی کو شاید اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ اقلیت ہونے کے باوجود مسلمان ایک بہت بڑی سیاسی طاقت ہیں اور ان کے جذبات اور ان کی امنگوں کو اب زیادہ دیر تک پامال اور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آج بھی مسز گاندھی کو دیانتداری سے اپنی غلطی اور مسلمانوں کے ساتھ جانیوالی بے انصافیوں کا احساس ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو غلط قسم کے لوگوں سے مفاہمت اور دوستی کے خطرناک راستے پر آگے بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جن سنگھ، کانگریس (او) اور سوتنتر پارٹی کے ساتھ کسی قسم کا سنگھٹن مسلمانوں کی نجات کا راستہ نہیں، یہ لوگ مسلمانوں کے دوست نہیں، اندرا گاندھی کے دشمن ہیں اور ان سے مفاہمت ہمارے مفادات کے منافی ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد ہمیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنا ہے اور بس!

مجھے آج بھی مسز گاندھی کے سیکولرازم پر مکمل وشواس ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی تمام خامیوں، خام کاریوں اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کوتاہیوں کے باوجود وہ ہندوستانی مسلمانوں کی دوست ہیں۔ لیکن افسوس کہ انہیں کچھ طالع آزما فخرالدینوں اور چھاگلوں نے گمراہ کردیا ہے اور وہ مسلمانوں کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ وہ ان بوڑھی دیواروں کو توڑ کر مسلمانوں کے دل کی دھڑکنیں سنیں، تاکہ انہیں اندازہ ہوجاتا کہ انہیں کس حد تک گمراہ کیا گیا ہے۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا ہے۔ اور مسز گاندھی کو بہت جلد فیصلہ کرنا چاہئے۔

......☆......

(۳۱/مارچ ۱۹۷۳)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

قاسم صاحب کے چھ ماہ

سید میر قاسم کو اقتدار سنبھالے ہوئے آج ٹھیک چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی شخصیت، کارکردگی یا اسٹائل کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا ممکن نہیں۔ جس طرح مشاعروں میں کسی بڑے شاعر کے کلام سنانے کے بعد چھوٹے اور گمنام شعرا کا جمنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح سیاسی میدان میں بھی کسی مشہور کھلاڑی کے کھیل کے بعد نو آموز کھلاڑیوں کا تماشائیوں سے داد تحسین وصول کرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔

سید میر قاسم کے پیش رو، بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق، دونوں ہی کشمیر کی اِس قیادت کا حصّہ تھے کہ جس نے تحریک حریّت کے ساتھ ہی نشو ونما پائی، اِن دونوں لیڈروں کے ساتھ جنگ آزادی کی کچھ یادیں وابستہ تھیں اور ان کی ذات سے کچھ تاریخی حقائق اور کُچھ اہم واقعات بھی منسوب تھے۔ ان سے شدید سیاسی اختلافات رکھنے والوں کو بھی اِس بات کا اعتراف تھا کہ تحریکِ آزادی میں اِن دونوں بزرگوں کا اہم رول رہا ہے۔ جدوجہد آزادی سے وابستگی نے بخشی صاحب اور صادق صاحب دونوں کو ایک تاریخی عظمت عطا کی تھی۔ اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

وہ اپنی تمام کوتاہیوں اور محرومیوں کے باوجود وزارتِ عظمیٰ کے منصب کے لئے اجنبی نہ لگتے تھے، بخشی صاحب نے اس تاریخی منصب کو حقیر ترین ذاتی مفادات کے لئے استعمال کر کے اپنی شبیہ کو بری طرح مسخ کر دیا، اور اس جرم میں تاریخ نے انہیں تخت سے اٹھا کر تختے پر لٹکا دیا، صادق صاحب نے بخشی صاحب کے پھیلائے ہوئے اندھیرے میں شرافت اور دیانت کا ایک مدہم سا چراغ روشن کیا۔ اور ان کی زندگی کے آخری دور میں جب یہ چراغ بھجنے لگا تو ان کی اپنی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا، اور وہ تاریخ کے بے رحم ہاتھوں کی دست بُرد سے محفوظ رہ گئے۔ بخشی صاحب اور صادق صاحب، دونوں ہی ایک مخصوص اسٹائل کے مالک تھے۔ ان کے دورِ اقتدار پر ان کی شخصیت اور اسٹائل کی چھاپ بالکل واضح اور نمایاں ہے۔ اور ان سے سیاسی اختلافات کے باوجود مجھے اِس حقیقت کا اعتراف ہے کہ دونوں نے حکومت چلانے کا ایک ایسا اسٹائل ایجاد کیا تھا کہ جو نقل نہیں کیا جا سکتا اور جس کی اندھی تقلید خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ اسٹائل شخصی تھا، جس میں حکومت سے زیادہ شخصیت کا دخل تھا! قاسم کا تعلق اس نئی نسل کے ساتھ ہے کہ جو آزادی کی جدوجہد کے آخری مرحلے میں قافلۂ آزادی کے ساتھ شامل ہو گئی، اور اپنی روشن دماغی اور قابلیت کی بنا پر سینئر لیڈروں کی نظروں میں سما گئی، ۱۹۴۷ء میں قاسم صاحب کے سیاسی مرتبے کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ مشیر مال بننے کے بعد مرزا محمد افضل بیگ نے انہیں اپنا پی۔ اے مقرر کر دیا۔ یہ ان کے جوہرِ ذاتی کا کرشمہ ہے کہ وہ ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی کے ممبر بنے، اور پھر مسودہ آئین تیار کرنے والی کمیٹی کے ممبر، اس کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بعد وزیر اور اب وزیر اعلیٰ! مشیرِ مال کے پی۔ اے سے لے کر چیف منسٹری تک کا سفر سید میر قاسم کی صلاحیتوں اور انکی قابلیت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے اور اس کا اعتراف ان کے سابق BOSS اور ''ہم ضلع'' مرزا محمد افضل بیگ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن وزارتِ اعلیٰ کا منصب صرف قابلیت اور شرافت کا ہی نہیں، شخصیت اور انفرادیت کا بھی تقاضا کرتا ہے اور شاید قاسم صاحب کے لئے یہ ایک ناپسندیدہ حقیقت ہو کہ پچھلے چھ ماہ کے دوران نہ ان کی شخصیت اُبھری ہے اور نہ ان کی انفرادیت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیکوقت بخشی صاحب اور صادق صاحب کے اسٹائل اپنا کر اپنا ایک اسٹائل ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک یہ کوشش نہ صرف ناکام ہوئی ہے بلکہ اس نے قاسم صاحب کی شہرت کو بھی مجروح کر دیا ہے۔ ان میں نہ بخشی کا عامیانہ پن ہے اور نہ صادق کی نفاست، نہ ایک کی جسمانی قوت اور نہ دوسرے کی ذہنی استعداد اور نتیجہ یہ کہ وہ سب کچھ بننے کی کوشش میں ابھی تک کچھ نہیں بن پائے ہیں۔ قاسم صاحب افسروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کر کے اپنے وجود کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وجود کے اعلان سے شخصیت کی تعمیر اور اسٹائل کی انفرادیت نہیں اُبھرتی، اور نہ ہی .. افسروں کے تبادلے کسی خاص سوچ کی نشاندہی کرتے ہیں! ان کے بارے میں یہ مشہور ہو رہا ہے کہ ان میں قوتِ فیصلہ کی کمی ہے، اور وہ بہت سے فیصلے اس لئے ملتوی کرتے ہیں کہ انہیں اپنے پر اعتماد نہیں ہے۔ وزارت میں توسیع کا فیصلہ آج کئی ماہ سے ٹالا جا رہا ہے۔ اور یہ تاثر عام ہوتا جا رہا ہے کہ ان پر کئی جانب سے زبردست دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ بات کوئی سرکاری راز نہیں ہے کہ پنڈت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ترلوچن دت ہر معاملے میں مداخلت کر کے اپنی بات منواتے ہیں، اور وہ اپنے آپ کو چیف منسٹر سے کم رتبے کا آدمی ماننے کے لئے تیار نہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اگر برکت اللہ خان راجستھان کے وزیراعلیٰ ہو سکتے ہیں تو ترلوچن دت بھی سید میر قاسم کی جگہ منتخب ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر کرن سنگھ کا دباؤ ہے، کہ کابینہ اور ایڈمنیسٹریشن میں ان کے چہیتوں کو بھی نمائندگی ملنا چاہیئے۔ ایک اطلاع کے مطابق نئی دلی سے دُرگا پرشاد دباؤ ڈال رہے ہیں کہ اقتدار کی بندر بانٹ میں ان کے وفاداروں کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔ وزیرِ مملکت عبدالغنی لون کی قیادت میں ایک اور پریشر گروپ اُبھر رہا ہے، اوراس طرح قاسم صاحب ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش میں اپنا بہترین وقت ضائع کر رہے ہیں، نہ سیاسی میدان میں وہ کوئی IMPACT قائم کر سکے ہیں اور نہ اقتصادی شعبے میں۔ ان کے ارد گرد ان مکھیوں نے اپنا جال بنانا شروع کر دیا ہے کہ جو اقتدار کے شہد پر نچھاور ہو کر صاحبِ اقتدار کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ان ہی مکھیوں کی آنکھوں سے دیکھیں گے، انہی کے کانوں سے سُنیں گے۔ اور پھر انہی کے دماغ سے سوچیں گے۔ یہ حادثہ ان کے پیش رووں کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ اور تاریخ اپنے آپ کو دُہرانے کے لئے پر تول رہی ہے! قاسم صاحب کی حکومت پر ترلوچن دت کی.. چھاپ ہے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ کی چھاپ ہے۔ ڈی پی در کی چھاپ ہے۔ لیکن قاسم صاحب کی چھاپ نہیں اور ایک وزیراعلیٰ کے لئے اس سے بڑھ کر افسوس کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ ایڈمنسٹریشن میں کرپشن بڑھتا جارہا ہے۔ نوجوانوں کی مایوسی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ عدل و انصاف کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اداروں پر سے عوام کا اعتماد اُٹھتا جارہا ہے۔ بیکاری اور بیروزگاری کا گراف خطرے کے نشان سے بھی اونچا ہوگیا ہے، غربت اور افلاس نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے بے پناہ قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہے، لیکن پچھلے چھ ماہ کے دوران قاسم صاحب نے یہ شبہ بھی پیدا نہیں ہونے دیا ہے کہ وہ ان مسائل سے نپٹنے کی ہمت یا صلاحیت رکھتے ہیں۔ دِلّی کو خوش رکھنے کے لئے اٹوٹ الحاق کی رٹ لگانا ضروری ہے۔ لیکن دِلّی کو خوش رکھنا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوسکتا ہے بجائے خود مقصد نہیں بن سکتا۔ اور قاسم صاحب کو کبھی کبھی صادق صاحب کے اسٹائل میں دِلّی کو آنکھیں بھی دکھانا چاہیے۔ ہر بات اور ہر معاملے میں سرِ تسلیم خم کرنے سے دِلّی والوں کی عادتیں خراب ہوجاتی ہیں۔ جو بحثیتِ مجموعی قاسم صاحب اور کشمیر دونوں کے مستقبل کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی ہیں۔

قاسم صاحب کے سامنے کوئی سیاسی چلینج نہیں ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی مقابلہ کرنا، ان کے سیلبس میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے اس پر وقت اور توجہ صرف کرنا بے کار ہوگا۔ یہ مرکزی قیادت کا مسئلہ ہے۔ اور وہ خود اس سے نپٹنے کی کوشش میں مصُروف ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو بھی یہ بات جان لینا چاہیے، کہ ان کی جنگ قاسم صاحب سے نہیں۔ براہ راست شریمتی اندرا گاندھی سے ہے، اس لئے انہیں بھی قاسم صاحب کی راہ میں کوئی مشکلات پیدا نہیں کرنی چاہیں تاکہ سید میر قاسم کو سیاسی بکھیڑوں میں رہنے کا بہانہ ہاتھ نہ آئے۔ ہم قاسم صاحب سے سیاسی مسائل کے حل کی توقع نہیں رکھتے۔ لیکن

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ایڈمنسٹریشن کو کرپشن سے پاک کرنے اور تعمیر و ترقی کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے سلسلے میں ہم نے ان سے ضرور کچھ اُمیدیں وابستہ کی ہیں۔ ابھی تک ہمیں مایوسی کے سواء کچھ نہیں ملا ہے۔ لیکن چھ ماہ کا عرصہ حتمی فیصلہ صادر کرنے کے لئے بہت کم ہے اور ہم آخری فیصلہ دینے سے پہلے ابھی کچھ دیر انتظار کرنے کے لئے تیار ہیں!

......☆......

(۱۵ر جون ۱۹۷۲)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شیخ محمد عبداللہ اور کشمیر

شیخ محمد عبداللہ کے ریاست میں داخل ہونے پر پابندی عائد کیوں کی گئی تھی؟ یہ ساری دُنیا کو معلوم ہے اس پابندی کو اب ڈیڑھ سال بعد ختم کیوں کیا گیا ہے، یہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا۔ سرکار کا دعویٰ ہے، کہ اب چونکہ علٰحید گی پسندوں میں نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے سوال پر بحث ہورہی ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ شیخ صاحب کو اس بحث میں شریک ہونے کا موقع دیا جائے۔ عام لوگوں کے خیال میں اصل وجہ حکومت کی دریا دلی یا وسیع النظری نہیں، بلکہ جعلی انتخابات کے سہارے آئندہ پانچ سال تک زندہ رہنے کا یقین ہے۔ اب جبکہ میونسپل انتخابات کے علاوہ سبھی انتخابات ختم ہو چکے ہیں۔ اس لئے شیخ صاحب کے وطن لوٹ آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شیخ صاحب پر سے غیر مشروط طور پر پابندی اُٹھانا، مرکزی اور ریاستی حکومت کے لیڈروں کی اس مشترکہ سوچ کا نتیجہ ہے، کہ جو پچھلے چند ماہ سے جاری تھی۔ اس سوچ میں یہ حقیقت مدِ نظر تھی کہ گرفتاریوں، مقدموں اور جلاوطنیوں نے شیخ عبداللہ کی عظمت اور مقبولیت کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہے اور طرح طرح کی سختیاں جھیل کر شیخ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

صاحب اپنے عزم اور ارادے میں زیادہ مستحکم ہو جاتے ہیں، چودہ سال جیل گذارنے کے بعد بھی ان کی آواز میں وہی اثر اور ان کی دُعاؤں میں وہی تاثیر ہے کہ جس نے ۱۴ سال قبل ایک مردہ قوم میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ ماہرین سیاست ونفسیات دونوں کیلئے شیخ محمد عبداللہ کی ذات ایک عجیب معمہ بنی ہوئی ہے۔ اور دونوں ہی اِس بات پر متفق ہیں کہ انہیں عام سیاستدانوں کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا، یہ احساس اب عام ہوتا جارہا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کشمیر میں ایک مخصوص سیاسی مکتبِ فکر کے رہنما نہیں، کشمیر کی آواز ہیں، انہیں جلاوطن کر کے کشمیر سے دُور رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن کشمیر کے عوام سے نہیں، شیخ صاحب اور کشمیر کا رشتہ عاشق ومعشوق کا رشتہ ہے اور اسے جیل خانوں کی دیواریں اور جلاوطنی کے فاصلے ختم نہیں کر سکتے۔ انتخابات کا ڈھونگ رچا کر کچھ لوگ حکومت پر قابض ہو سکتے ہیں۔ لیکن عوام کے دِلوں پر قبضہ کرنے کے لئے شیخ عبداللہ کا جذبہ عشق، اس کا خلوص، اور اِس کی استقامت چاہیے اور

ایں سعادت بزور باز ونیست

دِلّی کے ارباب اقتدار اور سرینگر میں اِن کے پرچون فروش کُھل کر اِس بات کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ لیکن انہیں اِس حقیقت کا احساس ہو چکا ہے کہ شیخ عبداللہ کی نظر بندی اور جلاوطنی سے کشمیری عوام کے سینوں میں تپتی ہوئی وہ آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی کہ جو ۱۹۵۳ء میں فوجی سنگینوں سے جلائی گئی تھی۔ اِس سال ۹ اگست کو ہندوستان کے تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش لیڈروں نے کشمیر کے اعتماد اور اعتقاد پر پہلا شب خون مارا، بداعتمادی اور باہمی تشکیک کی خلیج بڑھتی ہی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گئی، جب سے اب تک شیخ محمد عبداللہ کئی بار گرفتار ہو کر رہا ہو چکے ہیں، اور کوئی شخص یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، کہ گرفتاری یا رہائی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے، یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ خود ہندوستان کے لیڈروں نے تلواروں کی نوکوں سے کشمیر اور ہندوستان کے رشتے کو اِس درجہ کمزور بنا دیا کہ اس ریاست میں حکومت کا مسخرہ پن قایٔم کرنے کے لئے انہیں ہر بار شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو جیل خانوں میں بند کرنا پڑتا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی غیر مشروط رہائی اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کو نظر بند یا جلا وطن کرنے سے وہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ جس نے ہندوستانی رہنماؤں کو خود اپنی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے، جمہوریت کے علمبردار، دوسروں کیلئے آزادی اور انصاف کا مطالبہ کرنے والے اور عوام کو طاقت کا سرچشمہ ماننے والے نیتا، جب اپنے ہی ملک کے ایک حصّے میں جمہوریت، آزادی اور انصاف کی قدروں کو پاؤں تلے روندیں، تو اِن کی نیتوں پر کون شک نہ کرے گا۔ افسوس کہ ہندوستان کے ناعاقبت اندیش لیڈروں نے کشمیر میں چند حقیر مقاصد کے لئے پُورے ملک کی شبیہہ کو مسخ کر دیا۔

شیخ محمد عبداللہ ایک بار پھر ایک فاتحانہ شان کے ساتھ لوٹ رہے ہیں۔ اُنہوں نے دِلّی کے زنداں خانوں میں ڈیڑھ سال گذار کر پھر یہ بات ثابت کردی کہ کشمیر کا جسم نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس کی رُوح گرفتار نہیں ہو سکتی۔ ایک بار پھر اِس خوبصورت وادی کے بدقسمت لوگ اپنے عظیم قائد کی راہ میں آنکھیں بچھا کر اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کریں گے ایک بار پھر کشمیر اپنے عاشق، اپنے شاعر اور اپنے محسن کا استقبال کرنے کے لئے پھولوں کی بارش

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

برسائے گا۔ ایک بار پھر کشمیر کے زنداں خانے میں فلک شگاف نعروں کی گونج سنائی دے گی۔ یہ سب کچھ کئی بار ہو چکا ہے۔ اور اب کی بار پھر یہی ہوگا۔ لیکن کیا عقیدت کے مظاہرے، جلوس کی آن بان اور جلوسوں کی سج دھج ہی ہماری منزل ہے۔ کیا عظیم رہنما کی راہوں میں پھول بچھا کر ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں؟ کیا نعروں کی گھن گرج ہی ہماری منتہائے مقصود ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں، کہ جن پر عوام ہی کو نہیں عوام کے لیڈروں کی بھی سوچنا چاہیے، اور سب سے زیادہ خود شیخ محمد عبداللہ کو سوچنا ہوگا۔ حکومت نے ایک بار پھر ہتھیار ڈال دیئے ہیں لیکن کیا لیڈروں نے اپنا راستہ متعین کر دیا ہے؟ کیا شیخ محمد عبداللہ کو نئی صورتِ حال، اور نئے حقائق کا احساس ہے؟ کیا انہیں پچھلے ڈیڑھ سال کے دوران ہونے والی عظیم تبدیلیوں کا اندازہ ہے؟ کیا وہ جذبات کی سطح سے بُلند ہو کر حقائق کی بھٹی میں تپنے کے لئے آمادہ ہیں؟ کیا انہیں اِس بات کا احساس ہے کہ کشمیر کے عوام اپنی محبت اور عقیدت کا نذرانہ پیش کر کے ان سے جرأت مندانہ قیادت کی توقع رکھتے ہیں؟ کیا اُنہیں اِس بات کا علم ہے کہ پچھلے سترہ برسوں میں کشمیر کی رُوح کتنی بار زخمی اور اِس کا وجود کِتنی بار گھائل ہو چکا ہے؟ کیا وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پچھلے چند برسوں میں کشمیر کے ضمیر کو خریدنے کے لئے اِس ریاست میں کِتنی دولت بہائی گئی ہے اور کتنے بڑے بڑے زاہدوں اور ایمانداروں کو ٹکے بھاؤ خرید لیا گیا ہے؟ یہ سب بڑے تلخ حقائق ہیں۔ لیکن اِن سے آنکھیں چُرانا ایمان دار اور عاقبت اندیش رہنما کے بس کی بات نہیں! میں توقع رکھوں گا کہ شیخ صاحب عوامی جوش و خروش، جلسوں اور جلوسوں کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہنگاموں اور بُلند بانگ نعروں کی گھن گرج میں اِن حقائق پر بھی نگاہ رکھیں گے۔ تاکہ ان کی قیادت جرأت مندانہ اور باوقار ہونے کے ساتھ ساتھ بامقصد بھی ہو، قوموں کی زندگی میں اصولوں کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن بڑے اصولوں کے حصول کے لئے چھوٹے سمجھوتے کرنا غیر مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ اگر بنیادی اصول یہ ہے کہ کشمیر کو ہندوستان میں ایک باعزّت اور باوقار مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ تو میرا خیال ہے کہ اِس مقصد کے حصول کے لئے ہم ہندوستانی عوام کا اعتماد اور تعاون بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اِس کے لئے یہ ضروری ہے کہ شیخ محمد عبداللہ یہ بات ذہن میں رکھیں، کہ جب وہ سرینگر میں بات کر رہے ہوں گے تو ان کی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں سنائی دے رہی ہوگی۔ وہ ہندوستان کی حکومت کو نظر انداز کر کے اِسے ناراض کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ہندوستانی عوام کو ناراض کر کے اپنے مقصد اور اپنی جدوجہد کے ساتھ ناانصافی کرین گے۔ میں چاہوں گا کہ وہ کشمیر کا مقدمہ ہندوستانی عوام کی عدالت میں پیش کر کے اپنے اور اپنی قوم کے لئے انصاف حاصل کریں۔ اور میرا خیال ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں ان کیلئے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں!

......☆......

(۷؍جون ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسز گاندھی کیلئے لمحہ فکریہ

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کے باوجود، آج پھر سرینگر آرہی ہیں، اور وہ یقیناً کشمیر کے خوبصورت مناظر اور ریاستی حکومت کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کیلئے تشریف نہیں لا رہی ہیں۔ پاکستان کے سانحہ بنگلہ دیش کے سوال پر فوجی تصادم کا خطرہ ملتوی ہو گیا ہے، ٹل نہیں گیا ہے۔ اور اس لئے کشمیر کے دفاع کا مسئلہ اعلیٰ ترین سطح پر غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مسز گاندھی اپنے مختصر سے دورے میں دفاعی انتظامات کی دیکھ بھال کے علاوہ ریاست کی سیاسی صورت حال کا جائزہ بھی لیں گی۔ ایک اطلاع کے مطابق وہ صادق صاحب اور سید میر قاسم کے درمیان مصالحت اور مفاہمت کی آخری کوشش بھی کریں گی۔ اور دونوں لیڈروں کو اتفاق اور اتحاد کے ساتھ آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کا درس بھی دیں گی۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں کا کوئی فوری نتیجہ برآمد ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلے میں کچھ کہنا اگرچہ قبل از وقت ہوگا، لیکن رائے ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کہ اس آخری کوشش کے کامیاب ہونے کی بھی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دراصل صادق صاحب اور قاسم صاحب کے درمیان بے اعتمادی، بدظنی اور رقابت کی خلیج اتنی وسیع ہوگئی ہے۔ کہ اسے پند ونصائح، قیمتی مشوروں اور نیک دعاؤں سے پاٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن بن گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے، کہ "صلح وصفائی" کا ہر نسخہ دونوں لیڈروں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے بجائے رقابت کی آگ کو تیز تر کر دیتا ہے۔ آنے والے انتخابات کے امکانات اور اندیشوں نے اِس کشمکش کو ایک نئی شدت اور حدت عطا کی ہے۔ اور دونوں فریق ایک دوسرے پر مکمل غلبہ پانے کی اصطلاح میں سوچنے لگے ہیں۔ آثار وقرائن سے پتہ چلتا ہے، کہ جانبین کی طرف سے ۱۹۷۲ء کے "واٹرلُو" کے لئے بڑے زور وشور سے تیاریاں شروع کی گئی ہیں۔ مِسز گاندھی کے خیال میں چونکہ کشمیر کے دفاع کا سوال ریاست کے اندرونی سیاسی استحکام کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسلئے انہیں جائز طور پر صادق صاحب اور قاسم صاحب کی معرکہ آرائیوں سے پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔ اور وہ ایک بار پھر اپنی مسیحائی کا اعجاز دکھانے کے لئے تشریف لا رہی ہیں!

اِس میں کوئی شک نہیں ہے، کہ کشمیر کے دفاع کا سوال پورے ملک کی سلامتی اور سالمیت کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے اور اسے ہمارے ملک کی دفاعی سکیم میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ پاکستان کے ساتھ فوجی تصادم کی صورت میں، کشمیر کو ہر خطرے سے محفوظ رکھنا فوجی اور سیاسی، دونوں نکتہ ہائے نگاہ سے بے حد ضروری ہے۔ اور یہ بات باعثِ اطمینان ہے، کہ اِس اہم پہلو کی طرف مناسب توجہ دی جارہی ہے۔ لیکن ایک سرحدی ریاست کو دشمن کی یلغار

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے محفوظ رکھنے کیلیئے صرف سرحدوں کی حفاظت اور بیرونی دشمنوں کی پیش قدمی روکنا ہی کافی نہیں ہے، وہاں کے لوگوں کی سیاسی، ذہنی اور اقتصادی آسودگی کے ذرائع تلاش کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ بیرونی محاذ پر لڑنے والی فوجوں کو اندرونی محاذ سے طاقت، تقویت اور توانائی ملتی رہے۔ کشمیر کی بیرونی سرحدوں کو محفوظ رکھنے کے لئے پچھلے کئی سالوں کے دوران جو کچھ کیا گیا ہے، قابلِ تعریف ہے، لیکن اِس دوران میں اندرونی سرحدوں کو جس طور پر نظر انداز یا کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ قابلِ افسوس بھی ہے اور نا قابلِ معافی بھی!

مِسز اندرا گاندھی اور اُن کے مشیروں کو یہ خوش فہمی ہے کہ صادق صاحب اور قاسم صاحب کی دوستی کشمیر کے ہر درد کا مداوا ثابت ہوگی اور وہ پچھلے چار پانچ سال سے اپنا سارا وقت اسی مقصد کے حصول میں صرف کر رہے ہیں۔ قطع نظر اس امر کے اُن کی سعیٔ پیہم کا نتیجہ نا کامی اور نا مرادی ہے۔ اگر صادق صاحب اور قاسم صاحب واقعی دوست بن بھی جائیں، تو یہ سمجھ لینا کہ کشمیر کی اندرونی سرحدیں محفوظ ہوگئی ہیں، یا کشمیر کو اندرونی استحکام حاصل ہو گیا ہے، ایک غلط اور گمراہ کُن مفروضہ ہوگا! اصل بات تو یہ ہے، کہ صادق قاسم کشمکش بجائے خود اس سیاسی عدمِ استحکام اور نا آسودگی کا نتیجہ ہے، کہ جو پچھلے بیس بائیس برسوں سے کشمیر کا مقدر رہا ہے۔ اگر مسز گاندھی واقعی کشمیر میں سیاسی استحکام اور اہل کشمیر میں ذہنی آسودگی کے مسائل سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ تو انہیں صادق صاحب اور قاسم صاحب کی منت سماجت کرنے کی بجائے اس بنیادی مسئلے کو حل کرنے کی طرف توجہ دینا چاہیے، کہ جس نے ریاستی عوام کو بے چین اور مرکزی حکومت کو چند افراد کا محتاج بنا دیا ہے۔ اور یہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسئلہ ہے ریاست میں جمہوریت کی بحالی کا!

یہ صحیح ہے کہ ریاست میں کشمیر اور ہندوستان کے باہمی رشتے سے بے اطمینانی اور نا آسودگی کا اظہار کرنے والے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ (افسوسناک بات یہ ہے، کہ اِس تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا ہے) لیکن ہمیں ان لوگوں کے وجود سے گھبرا کر ایسے اقدامات نہیں کرنے چاہئیں، کہ جن سے ان کی تعداد اور قوت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اور بدقسمتی سے پچھلے بیس بائیس سال سے یہی ہوتا رہا ہے۔ جمہوریت کی بحالی، جمہوری اقدار کی آبیاری اور جمہوری اداروں کا استحکام، بلواسطہ طور پر ان لوگوں پر بھی ہندوستان کے سیاسی نظام کی خوبیاں واضح کر دیگا، جو ابھی تک صرف اس کی کمزوریاں اور کوتاہیاں ہی دیکھ پائے ہیں۔ بنگلہ دیش کے حالیہ واقعات تاریخی کا ایک ایسا سبق ہے، کہ جس سے ملک کے حکمرانوں اور کشمیری عوام دونوں ہی کو عبرت لینا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے، کہ عوامی سطح پر اس تاریخی سبق سے عبرت اور استفادہ حاصل کرنے کا عمل غیر محسوس اور غیر شعوری طور شروع ہو گیا ہے، لیکن بدقسمتی سے اس ملک کا حکمران طبقہ ابھی اپنے فرسودہ طرزِ فکر کی گمراہیوں سے باہر نہیں نکل سکا ہے اور آج بھی عوام کی بجائے افراد کی اصطلاحوں میں گفتگو کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ بنگلہ دیش جیسا غیر معمولی ملک اور دوررس نتائج کا حامل تاریخی واقعہ روز روز ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اور مسز گاندھی کو اس سے بالکل اسی طرح سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ جس طرح وہ اوروں کو اس سے سبق حاصل کرنے کا درس دے رہی ہیں۔ صادق قاسم سمجھوتہ کی بیکار اور بے سود کوشش اور بنگلہ دیش کے واقعات کا ادراک ضروری

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔ مناسب یہ ہے، کہ دلی سے کشمیر تک آنے کی زحمت گوارا کرنے کی بجائے مسز اندرا گاندھی دہلی میں نظر بند اُس کشمیری رہنما سے بامعنیٰ اور بامقصد گفتگو شروع کریں کہ جس کی ذات ہندوستان اور کشمیر کے تعلق کی بنیاد بھی ہے اور موجودہ بے اطمینانی کا اظہار بھی چین جیسے دشمن ملک کے سامنے دوستی کا دست سوال دراز کرنے والے لیڈروں کو ایک ایسے ناراض اور روٹھے ہوئے ساتھی کو منانے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ جس کی عبادت اور ریاضت نے آج کشمیر کو ہندوستان کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ ورنہ یہی سمجھا جائیگا۔ کہ گاندھی کا ہندوستان فوجی طاقت کے سامنے تو جھک سکتا ہے، لیکن اخلاقی اقدار کا احترام نہیں کرسکتا۔ دہلی میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی نظر بندی مسز گاندھی کی اخلاقی حیثیت اور ان کی سیاسی قیادت کیلئے ایک ایسا چیلنج ہے کہ جو چین اور بنگلہ دیش کے چیلنج سے بھی زیادہ اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مصالحت اور مفاہمت کی گفتگو، صادق، قاسم مصالحت کی کوششوں سے کئی گنا اہم، فائدہ منداور دیرپا ثابت ہوسکتی ہے، لیکن اس کے لئے بے پناہ اخلاقی جرأت، غیر معمولی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کی ضرورت ہے، مسز گاندھی اس کی اہل تو ہیں، لیکن ایسے معاملات میں پہل کرنے کیلئے جس مردانگی کی ضرورت ہے۔ وہ اس عورت میں شاید موجود نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں انتخابات کے نام پر فراڈ اور بے ایمانی کے فیصلے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرنے سے پہلے وہ اس امکان کا بھرپور جائزہ لیں گی۔

(۷رستمبر ۱۹۷۱ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کانگریسی فیشن پریڈ

کانگریسی راج کی مغرورانہ پالیسوں کے خلاف ملک بھر میں بے چینی کا لاوا پُھوٹ پڑا ہے اور کئی سال کی نمرود کی خدائی کے بعد عوامی ناراضگی سے یہ راج سنگھاسن ڈولنے لگا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اِس ہل چل اور اضطراب سے کانگریسی حکمرانوں کی نظریں اپنے باطن کی طرف مرکوز ہو جاتیں اور وہ اپنی اُن کرتوت کا جائزہ لیتے۔ جن کی وجہ سے ملک میں نہ صرف جمہوریت کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے بلکہ لوٹ کھسوٹ، سیاسی بددیانتی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا طوطی بول رہا ہے۔ اِسی طرح سے اگر وہ اپنے اعمال وافعال میں بہتری پیدا کرنے کی طرف توجہ دیتے تو یہ زیادہ مناسب اور برمحل ثابت ہوتا۔ لیکن کانگریسی حکمرانوں کو خون کا جو چسکہ پڑ گیا ہے اُس کا ثبوت یہ ہے کہ بے چینی کے اسباب وعلل پر غور کرنے کی بجائے اُنھوں نے فرضی وِلنوں کی تلاش شروع کر دی۔ اِس نامبارک مہم کا آغاز خود کانگریس راج کی مہارانی مِسز اندرا گاندھی نے یہ کہا کہ امریکی محکمہ کے جاسوس کارکن ان کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے سرگرم ہو گئے ہیں۔ مہارانی جی کی چشمِ ناز کا اشارہ پانا تھا کہ مبہوت اور مفلوج کانگریسیوں میں ایک نئی زندگی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پُیدا ہوگئی اور ملک کے کونے کونے میں ''سی آئی اے'' کی بے ہنگم آوازوں کا شور وُغل مچ گیا ریزگاری کی کمیابی سے لے کر روزگار کی نایابی تک طلباء کی بیزاری سے لے کر مزدوروں کی بے چینی تک اور بجلی کے منصوبوں میں تاخیر سے لے کر قیمتوں میں کئی گنا اضافے تک ہر ایک ناکامی اور نامرادی کو سی آئی اے کے سر پر تھوپ دیا گیا۔ مہارانی کے مُنہ سے جادو کے اِس منتر کا نکلنا تھا کہ ریاستوں میں کانگریس کے مقامی منصب داروں نے احتساب اور الزام کی تلوار پر صقیل شروع کردی اور انہیں اپنے سیاسی مخالفیں پر بے تحاشا چلانا شروع کردیا۔ کشمیر میں ڈھلی کی کٹھ پُتلیوں کے لئے تو یہ صورت حال اور بھی زیادہ خوش آئیند ہے چنانچہ کانگریس کی اس تازہ فیشن پریڈ میں شرکت کا اعزاز پردیش کانگریس کے 'جوکر' یعنی صدر ایوب کو بخشنا مناسب نہیں سمجھا گیا اور بہ ذات خود وزیر اعلیٰ اِس میں تمغہ حاصل کرنے کے لئے آگئے۔ اُنہوں نے کئی مقامات پر اس بات کا اظہار کیا کہ اُن کی سلطنت اِندرا داد یعنی قلمرو کشمیر پر بھی سی آئی اے کے غنیم نے دھاوا بول دیا ہے۔ لہٰذا حکومت اور کانگریس دونوں کو مستعد اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

ابھی وزیر اعلی کے اِن بیانات کی گونج بھی ختم نہ ہونے نہ پائی تھی کہ کشمیر میں قبل از وقت برفباری کا طوفان اُمڈ آیا اور اُس نے یہاں کی زندگی کو درہم برہم کردیا، وزیر اعلی کو اب اس طوفان کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرنا چاہئے اور بتانا چاہئے۔ کہ کس طرح سی آئی اے نے قُدرت کی طاقتوں کے ساتھ سازش کر کے یہاں کانگریس کو اکھاڑنے کے لئے یہ غیر معمولی صورتِ حال پیدا کردی ہے۔

کشمیر میں کانگریسی حکمرانوں نے جب بھی سازش اور مداخلت کے نعرے بُلند

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کئے ہیں، تو اُس کے بعد ہی اُنہوں نے عتاب اور عذاب کے جہنموں کو بھی عوام کے لئے ساتھ ساتھ کھول دیا ہے لہذا کانگریسی حکمرانوں کے ''کشمیر میں خطرہ'' کے تازہ نعرے سے بھی ہر کشمیری امن پسند اور وطن دوست کا خائف ہو جانا قُدرتی ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ اب کانگریس حکمران اپنی عیاشیوں اور نابکاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے دارو گیر کا کون سا سلسلہ شروع کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ تو خیر کشمیر کی پچیس سالہ آزادی کا ایسا سبق ہے۔ جس کو بار بار پڑھ کر کشمیری عوام ازبر کر چکے ہیں۔ ہمارا سوال اِس وقت وزیرِاعلیٰ سے یہ ہے کہ سی آئی اے کے سند یافتہ اور نمک حلال ایجنٹوں یعنی جماعتِ اسلامی کو کشمیر میں پناہ دینے اور پروان چڑھانے کے جُرم میں خود اُن کا کِتنا حصہ ہے۔ یہ جماعت پاکستان میں بھی ترقی پسند طاقتوں کے خلاف امریکی سامراج کا ایسا تیر ہے، جسے وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کشمیر میں اِس جماعت کو امریکی خُفیہ اداروں کی طرف سے جو امداد اور اعانت میسر ہوتی رہی ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور اِس کا اعتراف ایک مرتبہ مرکزی وزارت داخلہ نے بھی کیا تھا۔ لیکن پچھلے عام انتخابات میں کشمیر کے اُس سیاسی خلاء کو پورا کرنے کے لئے جو شیخ صاحب پر پابندی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا اور اپنی پارٹی کے اندرونی مخالفین کو نیچا دِکھانے کے لئے پردیش کانگریس کی موجودہ لیڈر شپ نے اِسی سیاسی طور ناجائز جماعت کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اس طرح سے ایک طرف تو کشمیر کے حرام کارانہ انتخابات کو محترم بنانے کے لئے اِن مولویوں کی ریش کو نیلام کیا اور دوسری طرف اِن داڑھیوں کے پیچھے پلنے والے شیطانوں کو کھُلا چھوڑ کر

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کانگریس میں اپنے مخالفین کا صفایا کروایا۔ یہ کام سرانجام دے کے اب وزیرِ اعلیٰ سی آئی اے کی اِس پروردہ جماعت سے اپنا معاشقہ ختم کرنے کی جدوجہد کررہے ہیں۔ لیکن یہ کام اب اُتنا آسان نہیں رہا۔ چنانچہ اسمبلی میں قاری سیف الدین نے اُنہیں حال ہی میں گزشتہ روز و شب کی یاد دلا کر شرمندہ کر دیا۔ ریاستی کانگریس کے رہنماؤں کو سی آئی اے کا شور بلند کرتے وقت اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اُن کے اقتدار میں خود سی آئی اے کی مہربانیوں کا حصّہ کتنا ہے۔

......☆......

(۳۱/اکتوبر۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کارِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

جن لوگوں کا حافظ بالکل ہی کمزور نہ ہو، انہیں یاد ہوگا، کہ جب ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت (صحیح یا غلط) قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہی تھی، جماعت اسلامی کے امیر المومنین ابوالاعلیٰ مودودی پٹھانکوٹ میں بیٹھ کر نظریۂ پاکستان کو غلط اور مسٹر محمد علی جناح کو نامسلمان ثابت کرنے کے لئے دلائل اور تاویلات گھڑنے میں مصروف تھے۔ انہیں اِس بات سے سخت کوفت ہو رہی تھی، کہ مسلمانانِ ہند مودودی صاحب جیسے عالم فاضل کو چھوڑ کر مسٹر جناح جیسے انگریز نما مسلمان پر لٹو ہو رہے ہیں، اِس لئے اُنہوں نے بیکوقت پاکستان کے تصور اور مسٹر جناح کی قیادت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ اور جس قدر ممکن ہو سکتا تھا، مسلمانانِ ہند کو قیام پاکستان کے لئے جدوجہد سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مودودی صاحب اگر اپنے اس نظریئے پر قائم رہتے تو ہمیں آج یہ کہنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ کہ اُنہوں نے غیر معمولی تاریخی بصیرت اور حیران کُن عاقبت اندیشی کا ثبوت دیکر مسلمانانِ ہند کی صحیح رہنمائی کی، لیکن جب ان کی شدید مخالفت اور مزاحمت کے باوجود پاکستان معرضِ وجود میں آیا، تو مودودی صاحب

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اپنی تاویلات کا دفتر سمیٹ کر فوراً ہی پاکستان پہنچ گئے، اور وہاں بقولِ صدر ایوب اُنہوں نے پاکستانی مسلمانوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ صرف چند دِن پہلے جو پاکستان اسلامی نکتہ نگاہ سے ناجائز اور حرام تھا اب مودودی صاحب کے لئے حلال بن گیا تھا، اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خود وہیں آباد ہوگئے، پاکستان میں اپنے قدم جمانے کے ساتھ ہی مودودی صاحب اور ان کی جماعتِ اسلامی نے پاکستانی رہنماوؤں کے لئے مشکلات پیدا کرنی شروع کر دیں اور اُس وقت جبکہ پاکستان اپنی زندگی کے انتہائی نازک دور سے گزر رہا تھا۔ مودودی صاحب نے تمام تنگ نظر اور مفاد پرست ملاؤں کی قیادت سنبھال کر نئے نئے فتنے ابھارنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں وہ اِس غلط فہمی کا شکار رہے، کہ پاکستان چوں کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اِس لئے اِس کا نظم ونسق عالمانِ دین اور مولویانِ کرام کے سپُرد کر دیا جائے گا۔ اور اس طرح مودودی صاحب اور اِن کے قبیل کے داڑھی پوش پاکستان کی قضاوقدر کے مالک بنا دیئے جائیں گے۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح نے پاکستان کانسٹی یونٹ اسمبلی میں اپنی پہلی تقریر میں ہی ان کی غلط فہمی رفع کر دی۔ اور صاف الفاظ میں یہ اعلان کیا، کہ پاکستان ایک ایسی ترقی پسند، سیکولر سٹیٹ ہوگی کہ جہاں ہندو اور مسلم کے درمیان کوئی امتیاز روانہیں رکھا جائے گا۔ جناح صاحب کے اِس اعلان سے مولوی اور مودودی صاحبان سخت بدحواس ہوگئے۔ اور اُنہوں نے 'اسلام خطرے میں' کا نعرہ بُلند کر کے پاکستانی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جب تک جناح صاحب زندہ رہے، مودودی صاحب

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اوران کے قبیلے کی دال نہ گل سکی، لیکن اُن کے انتقال کے بعد مُلایانِ پاکستان نے ایک متحدہ محاذ بنا کر پاکستانی حکمرانوں کی ناک میں دم کر دیا۔ اور یہ مودودی صاحب جیسے عالمانِ دین ہی کا کارنامہ ہے کہ پاکستان اپنے قیام کے گیارہ سال بعد بھی اپنے لئے آئین مرتب نہ کر سکا۔ جب بھی پاکستان کے لئے آئین تیار کرنے کے لئے کوئی صدقلانہ کوشش کی جاتی، مودودی صاحب اور اِن کی برادری اسے خالص اسلامی'' بنانے کا کوئی اڑنگا لگا کر اِن کوششوں کو ناکام بنا دیتی۔ ۱۹۵۳ء میں اپنی چودھراہٹ اور دوکانداری جمانے کے لئے تمام پاکستانی ملاوؤں نے مِل کر ایک اور فتنہ کھڑا کر دیا اور پاکستان بھر میں قادیانیوں کے خلاف اجیٹیشن شروع کر دی۔ اس اجیٹیشن کے دوران جماعت اِسلامی کے'' مومنوں'' نے قادیانیوں کو زندہ جلانے سے بھی گریز نہ کیا اور بربریت اور بہیمیت کے وہ وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے پنجاب بھر میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ اِن فسادات کی تحقیقات کے لئے حکومتِ پاکستان نے جسٹس مُنیر کی قیادت میں جو تحقیقاتی کمیشن قائم کیا تھا۔ اِس کی جامع رپورٹ اِس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں پاکستانی ملاوؤں کی اصلیت اِن کی فطرت اور خباثت کو پُوری طرح بے نقاب کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۳ء کی یہ اجیٹیشن مودودی صاحب کی اِس اسلامی حکومت کا ایک نمونہ تھا کہ جو وہ پاکستان میں قائم کرنا چاہتے تھے، اور خدا کا لاکھ لاکھ شُکر ہے، کہ حکومتِ پنجاب کی موثر کاروائی نے اِس فتنے کو دبا دیا۔

۱۹۵۸ء میں فوجی کمانڈر اِن چیف جنرل ایوب کے حکومت پر قابض

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہونے کے بعد جب پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ تو جماعتِ اسلامی کے امیر المومنین ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت کے دوسرے سرکردہ لیڈروں کو بھی دوسرے سیاسی طالع آزماؤں کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا اور صدر ایوب نے بڑی سختی کے ساتھ مودودی فتنے کو کچلنے کے لئے اقدامات کئے۔ جماعت اِسلامی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اور اسلام کے نام پر افیم بیچنے والے اِن چور بازاریوں کے کاروبار کو سخت دھکا لگا۔ صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں اسلام کے اِن غازیوں کو کھُل کر نہ تبلیغ اسلام کی ہمت پڑی، اور نہ تشہیر ایمان کی، لیکن چوری چھپے اِسلام کے نام پر مسلمانوں کو گمراہ کر کے اپنی دکان اور اپنا دھندا چلانے کے شغل سے یہ لوگ باز نہیں آئے۔ اور ۱۹۶۸ء کے آخر میں جب صدر ایوب کے اپنے اعمال کی وجہ سے پاکستانی عوام اِن سے حد درجہ متنفر اور بیزار ہو کر اِن کے خلاف متحد ہو گئے، تو جماعتِ اسلامی کے بزدل بھی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر اِس عوامی احتجاج اور بغاوت میں شریک ہو گئے۔ متحدہ اپوزیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے مودودی صاحب کو بھی صدر ایوب کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔ اور اُنہوں نے اِس موقع سے کما حقہ فائدہ اُٹھایا۔ لیکن اسی دوران میں انہیں یہ غلط فہمی بھی ہو گئی، کہ اب پاکستان میں اِن کے طرز کی اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے فضا اور ماحول سازگار ہے اور وہ آسانی کے ساتھ بھولے بھالے پاکستانیوں کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ اِس خوش فہمی کی بناء پر جماعتِ اسلامی کے لال بجھکڑوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں حصہ لینے کی حکمتِ عملی مرتب کی اور یہ دعویٰ کرنا شروع کیا کہ قومی اور صوبائی اسمبلی دونوں میں، جماعتِ اسلامی کو اکثریت حاصل ہو گی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو کافر اور اِن کی جماعت کو لادینی قرار دیکر مودودی فتنہ گر اپنی جگہ مطمئن ہو گئے کہ اُنہوں نے اپنے سب سے بڑے حریف کو چاروں شانے چت کرا دیا ہے۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات نے جماعتِ اسلامی کے ملاؤں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ پاکستانی عوام نے نہ صرف اسلام کی تجارت کرنے والے اِن سوداگروں کو ٹھکرا دیا، بلکہ اِن کے سب سے بڑے حریف مسٹر بھٹو اور اِن کی جماعت پیپلز پارٹی کے سر پر عوامی مقبولیت کا تاج سجا دیا۔ جماعتِ اسلامی کے لیڈروں کے لئے یہ صدمہ غیر متوقع بھی تھا اور جان کاہ بھی۔ اور وہ ابھی تک اس کی تاویلوں اور توجیہوں میں مصروف ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے آغاز میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان آئینی بحران نے جب پاکستان کے وجود کے خطرے میں ڈال دیا تو مودودیوں کو ایک بار پھر اپنی لیڈری چمکانے کا موقع مِل گیا اور اُنہوں نے مشرقی پاکستان میں البدر نام کی ایک والینٹر فورس منظّم کر کے بنگالیوں کو طاقت اور بربریت کے بل بوتے پر زیر کرنا چاہا، یہ جماعتِ اسلامی اور البدر جیسی تنظیموں کے دباؤ ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ صدر یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن کی اندرونی خود مختاری کے معقول مطالبات کو تسلیم نہ کر سکے، اور اُنہوں نے بدحواسی میں "مسلم بنگال" کے خلاف اُس فوجی کاروائی کا حکم دیا کہ جس کے نتیجے میں پاکستان کی سالمیت اور وحدت دونوں ہی ختم ہو گیئں۔ فوجی کاروائی سے پہلے اور اِس کے دوران نہتے بنگالیوں پر ظلم و تشدد، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کے جتنے ہوشربا واقعات رُونما ہوئے ہیں، اِن میں دس فیصدی اِس البدر تنظیم کا 'کارنامہ' ہیں۔ کہ جسے جماعتِ اسلامی کی والنٹیر فورس کہلانے کا فخر حاصل

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔ دُنیا بھر کے اخباری نمائندوں نے اِس بات کی ناقابلِ تردید شہادت دی ہے۔ کہ ظلم وتشدد کی جو کاروائیاں پاکستانی فوج سے منسوب کی جاتی ہیں، وہ زیادہ تر جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والی تنظیم البدر کا' کارنامہ' ہیں۔ اِس طرح دُنیا کو جماعتِ اسلامی کے طرز کی اسلامی حکومت کا ایک اور نمونہ دیکھنے کا موقع مِلا ہے۔

اب جبکہ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے پورے ۱۳ سال کے بعد پاکستان میں جمہوریت بحال کر کے پاکستان کی عوام کو تحریر وتقریر کی آزادی دی ہے تو پاکستانی ملاؤں کو پھر زبان کھولنے کی ہمت ہوئی ہے۔ لیکن کارِ ملا چونکہ فی سبیل اللہ فساد ہے۔ اس لئے پاکستان کے مودودی اور مولوی سبھی اِس کوشش میں ہیں کہ کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دیا جائے، تاکہ ان کی دُوکان چلتی رہے۔ پاکستان میں اس وقت سب سے اہم اور نازک موضوع بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا ہے اور صدر بھٹو نے اس معاملے میں حد درجہ حقیقت پسندی کا ثبوت دے کر ایک صحیح موقف اپنایا ہے۔ اِن کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش ساری دُنیا کے لئے ایک حقیقت بن چکا ہے اور پاکستان کے لئے اس حقیقت سے آنکھیں بند کرنا اپنے مفاد میں نہیں ہے وہ رائے عامہ کو اس بات کے لئے تیار اور ہموار کر رہے ہیں کہ پاکستان کو جلد یا بدیر ناگزیر طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ مسٹر بھٹو کے خیال میں بنگلہ دیش کو تسلیم کئے بغیر جنگی قیدیوں کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہونے کا اندیشہ ہے اور اِن کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں۔ اپنے اِس موقف کے لئے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے مسٹر بھٹو آجکل سرحدی صوبے کا دورہ کر رہے ہیں اور پاکستان کا دانش ور طبقہ صدر کی اِن کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی، کہ اس

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

موضوع پر بھی صدر کی مخالفت کرنے میں جماعتِ اسلامی اور اِس کے امیر المومینین ابوالاعلیٰ مودودی پیش پیش ہیں اور اُنہوں نے یہ فتویٰ صادر کر دیا ہے، کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا، پاکستان کیساتھ غداری کے مترادف ہے وہ صدر بھٹو کے ہاتھوں اپنی شکستِ فاش کا بدلہ لینے کے لئے قدم قدم پر ان کی راہ میں مشکلات پیدا کر رہے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں تاخیر کے باعث خود پاکستان کا نقصان ہو رہا ہے، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی راہ میں حتی الامکان رکاوٹیں پیدا کرنے کی کرششیں کر رہے ہیں۔ پاکستان ٹائمنر نے مولانا مودودی کے اِس تازہ رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنے اور اپنی جماعت کے مفادات کی خاطر پاکستان کیا پورے عالم اسلام کو قربان کر سکتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے صدر مسٹر بھٹو مودودی صاحب کی دخل در معقولات کے باوجود اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس جماعتِ اسلامی کی ایک ناجائز اولاد۔ جماعتِ اسلامی کشمیر، کشمیری مسلمانوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کا دعویٰ کر رہی ہے۔ اور اس کوشش میں پنچایتوں، میونسپل کمیٹیوں اور قانون ساز اسمبلیوں کی چوکھٹ پر اپنا سر پھوڑ رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے، کہ پاکستانی مسلمانوں کی طرح کشمیری مسلمانوں نے بھی اِس اسلام فروش جماعت کو مُنہ لگانے سے انکار کر دیا ہے اور مودودی مُلاّ اپنے اور اپنی برادری کے لئے درسِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

......☆......

(۲۳ رنومبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ذُوالفقار علی بھٹو

پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کو ایک سال بیت گیا ہے۔ یوں تو پاکستان سیاسی لحاظ سے ایک الگ مملکت ہے اور قاعدے کے طور پر ہمیں اِس کے اندرونی اُتار چڑھاؤ سے زیادہ دل چسپی نہیں رکھنی چاہیئے۔ لیکن تاریخ، جغرافیہ، تمدّن، مذہب، زبان اور نسل کے رِشتوں نے ہمیں اِس مُلک کے ساتھ اِس انداز سے متعلق کر رکھا ہے کہ وہاں کی داخلی زندگی میں جنم لینے والی کوئی بھی لہر ہمارے ملک کی قومی زندگی میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ صِرف ہماری عوامی زندگی ہی پاکستان سے آنے والی مون سون ہواؤں کی زد میں نہیں ہے ہماری داخلی اور خارجی پالیسیوں کی پیشانی پر بھی پاکستان کی تحریر کبھی نمایاں اور کبھی زیرِ نقاب سطور پر نظر آتی ہے جن سنگھ کے فرقہ پرست فِسطائی تو اب بھی ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ بہتان تراشنے سے باز نہیں آتے کہ اُن کا جسم تو ہندوستان میں ہے، لیکن دراصل اُن کے دِل کی دھڑکنیں پاکستان کا ساز بجاتی ہیں۔ یہ تمام مثبت اور منفی رشتے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پاکستان کی سیا سیات اور وہاں کی قومی زندگی سے دِلچسپی لینا اور اُن کا تجزیہ کرنا ہماری قومی صحت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے لئے ضروری بلکہ لابدی ہے۔

ذُوالفقار علی بھٹو جب پاکستان کے راج سنگھاسن پر بیٹھے تو اُن کے ہی الفاظ میں اس جہاز میں آگ لگ چکی تھی اور اُس کا بیشتر حصّہ زیرِ آب ہو چکا تھا۔ لیکن ایک سال کے عرصے میں اُنہوں نے صرف اِس ٹوٹے ہوئے سفینے کو نہ صرف غرق ہونے سے بچا لیا ہے، بلکہ ایسا نظر آرہا ہے کہ پچیس سال تک غیر جمہوری اقتدار کی ظلمتوں، تعصب اور تنگ نظری کے دھندلکوں سے نکلنے کے بعد اب اس سفینے کا رُخ دھوپ اور نجات کی وادیوں کی طرف پھر گیا ہے۔ یہ حیثیت ایک شخصیت کے مسٹر بھٹو کی ذات اب بھی بڑی پُراسرار اور بے چہرہ سی لگتی ہے۔ اُنہیں پاکستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے اُن کا رول اب بھی غیر واضح بلکہ مشکوک نظر آتا ہے۔ بہ حیثیت ایک سیاستدان اُنہوں نے غیر اصولی سمجھوتے کئے ہیں اور بیک وقت ولی خان اور قیوم خان ----- اور فیض احمد فیضؔ جیسے نظریاتی انتہاؤں کو اپنے اقتدار کا ستوں بنانا چاہا ہے۔ بہ حیثیت ایک مُدبّر کے اُنہوں نے تلون مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے اور بعد میں اِس تلون کو یہ کہہ کر محترم بنانے کی کاشش کی ہے کہ میں برصغیر کی پیداوار ہوں، جو بوالعجبیوں اور تضادات کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ بحیثیت ایک مقرر اُن کی مضحکہ خیز غلطیاں اور پینترے مذاق اور تفریح کا باعث بن گئے ہیں، لیکن اِن تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کو نہ صرف مسٹر جناح کے بعد پاکستان کی سب سے بڑی شخصیت قرار دینا پڑتا ہے۔ بلکہ ۷۲ء میں وہ برصغیر کی سیاست میں بھی سب سے اہم اثر (Influence) کی حیثیت سے یاد کئے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جائیں گے۔ اُنہوں نے اپنی روشن خیالی اور جرأت مندی سے برصغیر میں نفرت اور ظلمت کی قوتوں پر بھرپور حملہ کر کے ہند اور پاکستان کی دوستی کے اُس امکان کو دریافت کر لیا ہے جو ۲۵ سال تک جنگ و جدل اور اعصابی تناؤ کی گھاٹیوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی غلطیوں اور بظاہر غیر مستقل مزاجیوں پر فقرے کسنا آسان ہے۔ لیکن اُنہیں کیسا معاشرہ اور کس طرح کی مشکلات ورثے میں ملی تھیں، اُس کا اندازہ تک کرنا بے حد مُشکل ہے۔ صدر بھٹو کو اِندرا گاندھی کی طرح اپنے پیچھے کسی گاندھی، کسی نہرو اور کسی جے پرکاش نارائن کی تیشہ زنی سے ہموار کیا ہوا راستہ نہیں ملا تھا اُن کے راستے میں دُنیا کی سب سے کٹر مُلا شاہی، یحییٰ خانوں اور ایوب خانوں اور اِسی قماش کے دوسرے جنونیوں نے رکاوٹوں کے ہمالیہ کھڑا کر رکھے تھے۔ یہ بھٹو صاحب کی عقل پرستی اور روشن ضمیری کا ثبوت ہے۔ کہ اُنہوں نے پہلی بار اپنے ملک کے بھٹکائے گئے عوام کو سچی جمہوریت کی برکتوں کا احساس دِلایا۔ اُنہیں جذباتی تقریرون کے لذّت آمیز طلسم کی بجائے حقیقتوں کی لق ودق وادیوں سے آشنا کرانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ ۱۷۰ء میں جب پاکستانی افواج کو فیصلہ کُن شکست ملی تو ایک ایسی قوم کو یہ بتانا آسان نہیں تھا کہ اِس کی وہ فوجی برتری پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ جس کو کئی صدیوں کے فوجی افتخار کی روایات وِرثہ میں ملی تھیں۔ بھٹو صاحب نے اپنے اقتدار کے پہلے ہی ہفتے میں یہ حرفِ حق بیان کر دیا۔ اِس سے اُن کی قوم کو بجلی کا کرنٹ جیسا چھو گیا اور وہ پہلے پہلے بِتورا کر رہ گئی۔ لیکن بعد میں اسی اعتراف اور اقبال کی آغوش سے وہ سنبھلا ہوا احساس قومی پیدا ہوا جو قوموں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا سکتا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔ بھٹو صاحب نے ہی شملہ کانفرنس کے لئے پہل کی اور اِس حد تک شور مچایا کہ ہمیں بھی اُن کے پھیلائے ہوئے ہاتھ کو تھامنا پڑا۔ اور کوہ مری جانے والے ہماری وزیر اعظم کے قاصد درگا پرشاد در کا یہ قول تاریخ کے حافظے کا حصّہ بن گیا ہے کہ جب دوستی کا یہ نیا باب جنم لیتے ہی آنکھیں موند لینے والا تھا تو بھٹو صاحب کی ذاتی مداخلت اور تدّبر نے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو مُسکراتی ہوئی دھُوپ میں تبدیل کر لیا۔ اندورنی محاذ پر ایک جوشیلی اور EXCITED قوم کو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے تیار کرنے کی مہم بھی بھٹو صاحب تقریباً اکیلے چلا رہے ہیں۔ اُنہیں ایسا کرنے کے لئے صرف یہی نہیں کہ جماعتِ 'غیر' اِسلامی جیسی اسلام اور پاکستان دُشمن جماعتوں کے طعن وتبرّا کا شکار ہونا پڑ رہا ہے بلکہ اُن کے جلسوں میں باقاعدہ گولیوں کی دنا دن تک سنائی دی ہے۔ لیکن وہ ایک سوُرما کی طرح اپنے جذباتی اور مشتعل ہموطنوں کو بتا رہے ہیں کہ حقائق سے آنکھیں بند کر لینے سے حقائق غائب نہیں ہو جاتے۔ داخلی محاذ پر بھی اُنہوں نے ملاّئیت اور رجعت پسندی پر پے درپے پر وار کر کے مودودیوں اور اسی قماش کے دوسرے ملاّؤں کو اپنی زمین دوز کمین گاہوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھٹو صاحب آخری معرکہ جیت گئے ہیں لیکن کیا یہی کم ہے کہ پچیس سال کے بعد وہ صِرف اقتدار کے بل بوتے پر ہی نہیں، بلکہ بہتر نظریاتی اسلحہ سے اُن کا قافیہ تنگ کر کے اُنہیں مرحلہ بہ مرحلہ پسپا کر رہے ہیں۔ پاکستان کے قبائیلی سماج کو یکجا کرنے میں انہوں نے بڑی لچکدار حکمت عملی سے کام لیا ہے اور قیوم خان سے لیکر ولی خان جیسے تضادات کو اپنا حریف بنانے کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بجائے اپنے اقتدار کا حلیف بنالیا ہے۔ جمہوریت اُن کے ملک میں کیسی گہری جڑیں پکڑ رہی ہے اس کا اندازہ خان عبدالغفار خان کی واپسی سے ہوسکتا ہے۔ جنہوں نے سالہا سال کی جلاوطنی کے بعد صرف واپس وطن آنے پر ہی آمادگی ظاہر نہیں کی ہے بلکہ یہ کہہ کر بھٹو صاحب کی کوششوں کو اعزاز بخشا ہے کہ میرے خوابوں کا پختونستان وجود میں آگیا ہے۔ سارے پاکستان میں مختلف قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ایک نہایت صحت منداور سبق آموز مباحثہ جاری ہے اور ''ڈان'' کے ایڈیٹر مظہر علی خان نے یہ لکھنے کی جرأت تک کی ہے کہ مشرقی بنگال میں پاکستانی افواج نے درندگی اور خون ریزی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ یہ پاکستان کی پیشانی پر بدنما داغ بن گیا ہے یہ صحیح ہے کہ پاکستان کو ابھی وحشت اور تشدّد کے جھٹکے ہلا رہے ہیں۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہیئے کہ پچیس سال کے بعد دِلوں میں جما ہوا لاوا پہلی بار باہر آرہا ہے۔ اور پُوری شدت سے باہر آرہا ہے مسٹر بھٹو کو بڑی زبردست مشکلات کا سامنا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مشکلات کے اِس سمندر کی کوئی بپھری ہوئی لہر اُن کو نگل ہی ڈالے، لیکن پھر بھی اُن کی روشن خیالی، تدّبر اور جمہوریت کے بڑے اصولوں کا شہید قرار دیا جائیگا۔ اِس سے بڑی بات یہ ہے کہ اُنہوں نے پاکستانی عوام کو جمہوریت کی جس لذّت سے آشنا کردیا ہے۔ اب اُس کی چاٹ اُن سے چھینی نہیں جاسکتی۔ ہمارے ملک میں بہت سے ظلمت پرست اور اندھے تعصبی دِن رات مسٹر بھٹو کی ناکامی اور پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر شپ کے قیام کی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اُنہیں معلوم ہونا چاہئے کہ بھٹو صاحب ایک انفرادی شخص کا نام نہیں، برصغیر میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ترقی پسند قوتوں کے لئے ایک علامت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا اپنا مفاد اور اس سے بڑھ کر ہمارے اُصولوں کا مفاد اِس میں ہے کہ ہم پاکستان کی داخلی سیاست میں استحکام پیدا کرنے اور پاکستان کو ملاؤں کے جبڑوں اور جنونیوں کے چنگل سے نکالنے میں مسٹر بھٹو کی کوششوں کا ہاتھ بٹائیں۔ پاکستان کے ہر اقتدار دشمن گالی باز کو سراہنا اور پاکستان کے ہر حکمران کو کوسنا بڑے دِنوں سے ہماری معیاری اور مستند پالیسی رہتی آئی ہے۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی بعض جماعتوں پر نظرِ ثانی کرنے کی اخلاقی جرأت بھی پیدا کرلیں۔ پاکستان کے مودودی قیوم خان اور اِسی قسم کے عناصر خواہ کسی بھی رنگ میں سامنے آئیں، ہمارے اتحادی نہیں بن سکتے۔ ہاں۔۔۔ عبدالغفار خان۔ فیض احمد فیضؔ اور غوث بخش بزنجو بڑی حد تک ہمارے اتحادی اصُولوں کا پرچم تھام سکتے ہیں۔ اِن قوتوں کا ہراول دستہ اِس وقت بھٹو صاحب ہیں اور ہمیں اُنکی اِس حیثیت کو اُس وقت تک کھُلے دِل سے تسلیم کرنے میں گریز نہ کرنا چاہیئے۔ جب تک خدانخواستہ وہ مُلائیت اور لشکرشاہی کے آگے مکمل طور پر ہتھیار نہیں ڈالتے ہمیں اُن کے عارضی پینتروں پر سیخ پا ہونے کی بجائے اُن کے دور رس مقاصد پر نظر ڈالنی چاہیئے اور اِسی تجزیے کے مطابق اپنا رویہ متعین کرنا چاہیئے۔

......☆......

(۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

قاسم صاحب کی مساعئ جمیلہ

چند ماہ قبل، انہی صفحات پر، میں نے وزیر اعلی سید میر قاسم کے شش ماہی دورِ حکومت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی، کہ قاسم صاحب کے سٹائل میں انفرادیت کی کمی ہے، اور وہ بیکوقت بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، باوجود اس کے کہ میری رائے میرے مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھی، مجھے اِس بات کا اعتراف ہے، کہ قاسِم صاحب کی شخصیت اور ان کی اہلیت کے متعلق یہ رائے قایٔم کرنے میں، میں نے کچھ جلدی کی تھی۔ چھ ماہ کا مختصر عرصہ شخصیت اور انفرادیت کے مکمل اظہار اور نکھار کے لئے شایٔد نا مکتفی ہے، اور اس لئے قاسم صاحب کے متعلق صحیح اندازہ کرنے میں مجھ سے چُوک ہوئی، وزیر اعلی کی حیثیت سے سید میر قاسم کی اہلیتں اور صلاحیتیں اب اُبھرنے لگی ہیں اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ایک اپنا اسٹائل ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کشمیر کی مخصوص اور منحوس سیاسی فضا میں پرواز کے امکانات محدود ہیں، لیکن سید میر قاسم کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ اس محدود کائنات میں کچھ نئے افق تلاش کر کے ہی دَم لیں گے۔ قطع نظر اِس بات کے کہ وہ اس تلاش میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام۔ اِن کے عزائم اور ارادے بجائے خود ایک نئی سِمت کا آغاز ہیں۔ اور میں انہیں ان کی ہمت حوصلے اور حسنِ تدبیر کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔

عید کے دِن وزیر اعلیٰ کا شیخ صاحب کی قیام گاہ پر جا کر انہیں عید کی مبارک باد دینا بظاہر ایک رسم اور اخلاقی فریضے کی ادائیگی کے سِوا کچھ نہیں تھا، لیکن گزشتہ ۱۹ سال کے دوران کسیِ وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کو یہ رسم اور یہ فرض نبھانے کی ہمت اور توفیق نہیں ہوئی تھی اور قاسمِ صاحب نے اس سماجی رسم کو نبھا کر سیاسی ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی ہے، عید کے دوسرے دِن شیخ صاحب کا وزیر اعلیٰ کی طرف سے دیئے گئے عصرانے میں شریک ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ قاسم صاحب کے عمل کا ردِ عمل بھی خوشگوار رہا ہے اور ۱۹ برس کے بعد کشمیر کے سیاسی رہنماؤں کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ سیاسی اختلافات کا سماجی تعلقات پر اثر انداز ہونا مہذب ذہنی رویے کی نشان دہی نہیں کرتا۔ وزیر اعلیٰ کا شیخ صاحب کے ہاں جانا اور شیخ صاحب کا وزیر اعلیٰ کے عصرانے میں شریک ہونا، بظاہر ایک معمولی سی بات ہے، لیکن جو لوگ کشمیر کی تاریخ اور سیاست سے واقف ہیں، وہ اس معمولی بات کی غیر معمولی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ پائیں گے۔

۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد حکومت نے اپنے سیاسی مخالفوں کے ساتھ جو رویہ اپنایا۔ اس نے کشمیر کے سیاسی ماحول کو اس درجہ متعفن اور متبذل بنا دیا کہ اس میں سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا تھا۔ حکومت وقت کا ہر سیاسی مخالفِ، اربابِ اقتدار کا ذاتی دشمن قرار پایا۔ نظریات کی کش مکش، ذاتیات

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کی جنگ بن کر رہ گئی، اور مطلق العنان حاکموں نے اپنے سیاسی مخالفوں کی مزاحمت ختم کرنے کیلئے ناجائز سے ناجائز حربہ استعمال کیا۔ شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد ان کے بیوی بچوں، رشتے داروں اور ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں کی زندگی اجیرن بنادی گئی، ان کے ساتھیوں، عقیدت مندوں اور اِن کی بے گناہی پر یقین رکھنے والوں پر بے تحاشا مظالم ڈھائے گئے، اور اس طرح سیاسی اختلافات نے انتقام گیری اور ذاتی عداوت کی جگہ لی۔ اِس ماحول میں ذاتی تعلقات تو کیا، سماجی تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی، اور آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے دوش بدوش لڑنے والے ساتھی، ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ ۱۹۶۴ء میں خواجہ غلام محمد صادق کے برسر اقتدار آنے کے بعد پہلی بار مستقل تصادم PERPETUAL CONFRONTATION کے اِس ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی تھی، لیکن یہ تبدیلی عارضی ثابت ہوئی، اور سیاسی اختلافات بدستور سماجی تعلقات کی بحالی میں مانع رہے۔ صادق صاحب اور بخشی صاحب کی موت پر شیخ صاحب کے ردِعمل کو اِس پسِ منظر میں دیکھنا چاہیئے، اور قاسم صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کو، اس لئے میری نگاہوں میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے، کہ مرحوم خواجہ غلام محمد صادق بھی شیخ صاحب کے ساتھ ذاتی تعلقات بحال کر کے، سیاسی ماحول کے تناؤ اور کھچاؤ کو کم کرنے کے لئے کوشاں تھے، شیخ صاحب سے سیاسی اختلافات کے باوجود اُن کے دِل میں اِن کے لئے بے حد احترام تھا اور انہیں اِس بات کا اعتراف تھا، کہ شیخ صاحب کے قدوقامت، ان کی عظمت اور ان کے مرتبے کا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رہنما اب پیدا نہیں ہوسکتا، لیکن وہ طبعاً بہت شرمیلے اور وضعدار تھے، اور باوجود شدید خواہش کے اِس قسم کی پہل نہیں کر سکتے تھے کہ جو قاسم صاحب نے کی ہے قاسم صاحب کی ہمت اور جرأت کی داد دینا چاہیئے کہ اُنہوں نے وضع داری اور جھوٹے وقار کو بالائے طاق رکھ کر ۱۹ سال کے بعد ایک ایسی رسم نبھائی ہے کہ جس سے انسانی تعلقات کے ٹوٹے ہوئے دھاگے ایک بار پھر جڑ جانے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ قاسم صاحب کے شیخ صاحب کی قیام گاہ پر جانے سے نہ مسئلہ کشمیر حل ہوگا اور نہ اِن کے سیاسی اختلافات ختم ہوں گے، لیکن اِس سے جہاں ماحول کی کشیدگی اور قدم قدم پر تصادم کا اندیشہ کم ہو جائے گا۔ وہاں اِس بات کا بھی امکان ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی لیڈروں کے درمیان بدظنی، بیزاری اور بے اعتمادی کی خلیج کچھ گھٹ جائے۔ بعض اوقات، نہایت معمولی واقعات اور حادثات کے بطن سے بہت بڑے واقعات جنم لیتے ہیں۔ اور انسانی تعلقات کا مرہم تو گہرے سے گہرے زخم کو بھی مندمل کر سکتا ہے!

سید میر قاسم نے شیخ محمد عبداللہ کی قیام گاہ پر جا کر شیخ صاحب کی عظمت، ان کے مرتبے اور ان کی بزرگی کا اعتراف اور احترام کیا ہے، اور ایسا کرنے سے خود ان کا قد و قامت بڑھ گیا ہے، انہیں یقیناً اس بات کا احساس ہے، کہ شیخ محمد عبداللہ، کشمیر کی تحریکِ آزادی میں وہی درجہ رکھتے ہیں کہ جو ہندوستان کی تاریخ میں مہاتما گاندھی کو حاصل ہے اور گاندھی جی سے شدید اختلافات رکھنے والے لوگ بھی، اِن کی عظمت کا اعتراف اور ان کی شخصیت کا احترام کرتے تھے، شیخ محمد عبداللہ بھلے ہی اِس ریاست کے وزیرِ اعلیٰ نہ ہوں، لیکن ہندوستان کا شاید ہی کوئی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

لیڈر اِس حقیقت سے بے خبر ہوگا کہ وہ کشمیری عوام کے دِلوں پر حکومت کرتے ہیں، سید میر قاسم نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اس حقیقت کا اعتراف کر کے اپنا ہی نہیں، اپنی حکومت کا بھی اعتبار بڑھا دیا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ شیخ صاحب کے ذہن پر قاسم صاحب کی پہل INITIATIVE کا نہ صِرف خوشگوار اثر پڑا ہے۔ بلکہ اُنہوں نے قاسم صاحب کی طرف سے دیئے گئے عصرانے میں شرکت کر کے اِس بات پر رضامندی ظاہر کر دی ہے، کہ سیاسی اختلافات کے باوجود ذاتی اور سماجی تعلقات بحال ہو سکتے ہیں۔ یہ بات غیر متوقع نہیں کہ شیخ صاحب اور قاسم صاحب کے درمیان یہ معصوم سی مفاہمت اِن لوگوں کو بہت ناگوار گزرے گی، کہ جو اس ریاست میں تناؤ اور کھچاو برقرار رکھ کر اپنی چودھراہٹ برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اِس بات کا امکان بھی ہے کہ وفادارانِ ازلی کو قاسم صاحب کی یہ نیاز مندی اِس درجہ ناپسند ہو کہ وہ اِسے کسی بڑے خطرے، کی علامت سمجھ کر، اس سے پیدا شدہ خوشگوار ماحول کو مکدّر کرنے کی کوشش کریں۔ اِس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ مرکزی حکومت کے دلال قاسم صاحب کے اِس رویّے کی غلط تعبیریں اور تفسیریں کر کے دِلّی دربار میں خوف و ہراس کی کیفیت پیدا کریں، مجھے یقین ہے کہ وزیر اعلیٰ نے اِن تمام امکانات اور اندیشہ ہائے دور دراز پر غور و فکر کے بعد ہی یہ قدم اُٹھایا ہوگا۔ میں انہیں یقین دِلانا چاہتا ہوں، کہ کشمیر کے ذی شعور عوام اِن کے اِس اسٹائل کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اور یہ انتہائی خوشی کی بات ہے، کہ اُنہوں نے غیر معمولی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنے منصب اور مرتبے کو بُلند کر دیا ہے، میں یہ توقع

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رکھوں گا، کہ وہ حقیقت پسندی اور خلوصِ نیت کے اِن صحت مند مظاہروں کو اپنی فِکر اور سوچ کا حصّہ بنا کر ایک تاریخی رول ادا کریں گے۔ نئی دِلی میں مرکزی لیڈروں سے شیخ صاحب کی متوقع بات چیت کے پسِ منظر میں سید میر قاسم کے اِس رول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی۔

سید میر قاسم نے گزشتہ چند ماہ کے دوران سیاسی ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے کئی اقدمات کیئے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عرصے کے بعد حکومت احساس کمتری اور بے اعتمادی کے چکر سے نکل کر عوام کی بہتری کے لئے مثبت اقدام کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا، کہ ارادوں کو عمل اور عمل کو عمل پیہم بنانے میں بھی کامیابی حاصل ہوگی یا نہیں، لیکن یہ بات بجائے خود اہم ہے کہ حکومت کو عوام کی ضروریات ان کی مشکلات اور اِن کے مسائل کا احساس ہونے لگا ہے۔ اس سلسے میں بے کاری دور کرنے کے لئے ریاستی حکومت کی کوششوں کو عوامی حلقوں میں بہ نظر امتحان دیکھا جارہا ہے۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ قاسم صاحب اور اِن کے ساتھی اپنی کوششیں جاری رکھیں گے!

......☆......

(۱۵ر نومبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

خوش فہمیاں غلط فہمیاں

افواہ سازی اور افواہ بازی زمانہ قدیم سے اہلِ کشمیر کا من پسند شغل رہا ہے، اور سرینگر کو اِس سلسلے میں ہمیشہ ایک تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لارنس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''دی ویلی آف کشمیر'' میں خاص طور سے اہلیان سرینگر کے اِس جوہر طبعی کا ذکر کرتے ہوئے کئی دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں۔ من گھڑت، بے بنیاد اور بے سر پیر کی افواہوں کو لارنس کے زمانے میں 'خبر زینہ کدل' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لیکن کشمیر میں خبر زینہ کدل کی روایت اور اہمیت بدستور قائم ہے اور یہاں کے لوگ آج بھی حقائق کے مقابلے میں افسانوں اور خبروں سے زیادہ افواہوں پر اعتبار کرتے ہیں پچھلے چند ماہ سے اِس افواہ بازی نے سیاسی سطح پر ایک نہایت سنجیدہ صورتِ حال اختیار کی ہے اور ریاست میں ایک مصنوعی، غیر حقیقی اور پُر فریب فضا قائیم ہوگئی ہے۔ مقامی اخبارات نے قیاس کے گھوڑے دوڑا کر اِس فضا کی تعمیر میں مدد دِی ہے اور سیاست دانون نے اپنے ذو معنی، مبہم اور متضاد بیانات سے خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کی ایک نئ فصل کو جنم دیا ہے عام لوگ، بجا طور پر افواہوں کی اِس مسلسل

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

یلغار کا شکار ہو کر ایک عجیب ذہنی اِنتشار میں مُبتلا نظر آتے ہیں، اور صحیح اطلاعات کی عدم موجودگی میں اِس اِنتشار میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے میری خواہش ہے کہ میں حتی المقدور اور حتی الامکان صحیح صورت حال کو واضح کرنے میں اپنا حصّہ ادا کروں، تاکہ جو لوگ حقائق کو جذبات اور خواہشات سے بُلند ہو کر دیکھنے اور سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، وہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کر سکیں۔

اکثر مقامی اخبارات میں آئے دِن یہ خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی حکومت کے درمیان ایک فیصلہ کُن اور بامقصد بات چیت شروع ہو چکی ہے یا شروع ہونے والی ہے۔ بعض معاصروں نے ''معتبر ذرائع'' سے موصول ہونے والی خبروں کا حوالہ دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ سودیت روس نے کشمیر کو اندرونی خود مختاری دیئے جانے کا اصول تسلیم کر لیا ہے اور اب روسی لیڈر حکومت ہند پر زور دے رہے ہیں کہ وہ کشمیر کو مکمل اندرونی خود مختاری دے کر اس مسئلے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے، اِس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے کچھ ''باخبر'' لوگوں نے یہ افواہ بھی اُڑائی، کہ ہندوستان میں مقیم روسی سفیر شیخ محمد عبداللہ سے کئی ملاقاتیں کر چکے ہیں۔ شیخ صاحب کے ''ٹائمز'' لندن میں شائع شدہ انٹرویو کی بُنیاد پر افواہ بازوں نے یہ فرض کر لیا، کہ شیخ محمد عبداللہ اور ہندوستانی لیڈروں کے درمیان اندرونی۔۔ خود مختاری کے سوال پر ایک خفیہ سمجھوتہ طے پایا ہے اور عنقریب ہی کشمیر میں ایک بالکل نئی سیاسی صورتِ حال اُبھر آئے گی، بیگ صاحب کے بیانات، ان پر پابندی ختم ہونے کے احکامات اور کشمیر لوٹ آنے پر ان کے تازہ ترین ارشادات نے ان قیاسات کو مزید تقویت پہنچائی ہے، اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ واقعی کشمیر

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے موجودہ سیاسی ڈھانچے میں معرکتہ الارا، تبدیلیاں رُونما ہونیوالی ہیں۔ ایک نئی سیاسی پارٹی کے قیام کی خبر بڑے زوروں سے گشت لگا رہی ہے اور افواہ بازوں نے بیگ صاحب کے علاوہ مولانا محمد سعید مسعودی اور غلام محی الدین قرہ کو بھی اِس پارٹی سے وابستہ کردیا ہے۔ افواہوں کو زیادہ چٹ پٹی بنانے کے لئے شیخ صاحب اور بیگ صاحب میں اندرونی خودمختاری کے سوال پر اختلافات کا افسانہ بھی گھڑ لیا گیا ہے۔ خواجہ غلام محی الدین قرہ کی رہائی کے بعد ان کے بیانات اور دہلی میں طویل قیام کے دوران سرگرمیوں کی تاویلات کرکے یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ کشمیر کے سوال پر، کشمیری لیڈروں اور مرکزی حکومت کے درمیان تمام بنیادی اختلافات ختم ہوگئے ہیں، اور عنقریب ہی ریاست میں جمہوریت بحال کرکے ایک نئے دُور کا آغاز کیا جائے گا۔ نئی دہلی کے اخبارات نے بھی سرینگر میں مقیم اپنے نمایندوں کے مراسلات شایع کرکے اِس خیال کو تقویت پہنچائی ہے!۔

اِس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ پچھلے پانچ چھ ماہ کے دوران مرکزی حکومت کے طرف سے شیخ محمد عبداللہ کے خیالات جاننے، اور اِن کی سوچ کے متعلق اندازہ لگانے کی کئی کوششیں ہوئی ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ مرکزی حکومت کے کچھ مقتدر لیڈروں نے شیخ صاحب کے ساتھ ایک بامقصد بات چیت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اور اِس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں ہی لیڈروں نے الحاق کے متعلق اپنا موقف واضح کرکے بامقصد بات چیت اور باہمی مصالحت کے کُچھ نئے اِمکانات پیدا کئے ہیں۔ لیکن بات صِرف اتنی ہی ہے اور بس!۔ مسز اِندرا گاندھی نے شیخ صاحب اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بیگ صاحب کے بیانات پر جس محتاط قسم کا ردِ عمل ظاہر کیا ہے۔ اِس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہ محض ان بیانات کی بُنیاد پر کوئی بات چیت کرنے کے لئے تیار نہیں اِدھر شیخ صاحب کا نکتہ نظر یہ ہے کہ جب تک حکومتِ ہند ۱۹۴۷ء میں دستاویز الحاق کی رُو سے متعیّن پوزیشن کو بحال کرنے پر آمادہ نہ ہو، بات چیت سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مرزا محمّد افضل بیگ کے اندرونی خودمختاری کے مطالبے کو بھی اِسی پسِ منظر میں دیکھنا ہوگا۔ حکومتِ ہند کا موقف یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ غیر مشروط طور پر، بغیر کسی ذہنی تحفظ کے ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی حقیقت تسلیم کرلیں، تو ان کی بعض مشکلات کرحل کرنے کے لئے مکالمہ شروع ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب کا دعویٰ ہے کہ الحاق کی بُنیاد وہ دستاویز INSTRUMENT OF ACCESSION ہے کہ جس کی رُو سے صرف دفاع، مواصلات اور خارجی معاملات، مرکز کی تحویل میں دیئے گئے ہیں۔ اور باقی تمام معاملات میں ریاست کو مکمل اندرونی خودمختاری حاصل ہے جب تک یہ حیثیت بحال نہیں کی جاتی، الحاق کی آئینی، قانونی اور اخلاقی حیثیت مشکوک ہے۔ مرکزی لیڈر یہ دلیل دیتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے اب تک دُنیا بہت بدل چکی ہے۔ نئے حقائق اور نئی قدریں وجود میں آئی ہیں اور کشمیری لیڈروں کو ان حقائق سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔ شیخ محمد عبداللہ کا موقف یہ ہے کہ اِس بنیادی حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے کہ کشمیر سے الحاق کی بُنیاد دستاویز الحاق INSTRUMENT OF ACCESSION ہے اور جو لوگ اِس

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دستاویز میں مُعین حدُود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ الحاق کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور ان سے بات چیت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی حکومت کے درمیان نکتہ ہائے نگاہ کا یہ بنیادی اختلاف آج بھی اِسی طرح قایُم ہے، جس طرح سے دس سال قبل قایُم تھا اِس لئے ظاہری علامات کے باوجود صورتِ حال میں کوئی تبدیلی پیدا ہونے کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا! جہاں تک ذاتی سطح پر تعلقات کو خوشگوار بنانے کا سوال ہے۔ مِسز گاندھی نے کچھ مواقع سے فایدہ اُٹھا کر اِس سمت میں پہل کی ہے۔ مثلاً ابھی حال ہی میں جب شیخ صاحب کی صاحبزادی ثریا جان ہسپتال میں آپریشن کے لئے داخل ہونے والی تھیں۔ تو مِسز گاندھی نے ثریّا کے نام خط لِکھ کر اِن کی خبر خیریت دریافت کی۔ کُچھ دِن بعد جب سول فیملی ہاسپٹل دِلّی میں، ثریاّ جان کے ہاں بچّی پیدا ہوئی، تو مِسز گاندھی نے پھول بھیج کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ پھر جب ثرّیا ہسپتال سے گھر لوٹیں تو مِسز گاندھی نے ایک خط میں اسے مُبارکباد دیتے ہوئے بچی کے لئے نیک خواہشات کا تحفہ بھیجا۔ اِس طرح شیخ صاحب کی حالیہ بیماری کے دوران پرایُم منسٹر کے سیکریٹریٹ سے کئی بار شیخ صاحب کی خبر و خیریت دریافت کی گئی۔ لیکن خوش اخلاقی اور وضع داری کے اِن حوصلہ افزا مظاہروں کے باوجود مِسز گاندھی اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان باہمی تشکیک، بیزاری اور ناراضگی کی بہت بڑی خلیج حائل ہے اور جب تک اِن میں مفاہمت اور مصالحت کی کوئی بُنیاد قایُم نہ ہو۔ موجودہ سیاسی فضا میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ریاستوں کی اندرونی خودمختاری کے متعلق مِسز اِندرا گاندھی کے تازہ رویئے نے بات چیت کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

امکانات کو اور تاریک بنا دیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شریمتی اِندرا گاندھی اپنی بے پناہ سیاسی طاقت کا استعمال کر کے ملک میں ایک فیڈرل نظام کی جگہ وحدانی طرز حکومت قایٔم کرنا چاہتی ہیں۔ اِن حالات میں کشمیری عوام کو کسی خوش فہمی میں مُبتلا نہ رہنا چاہیے۔ جہاں تک مرزا محمد افضل بیگ کے ارشادات یا خواجہ غلام محی الدین قرہ کے بیانات کا تعلق ہے۔ میرا غالب خیال یہ ہے کہ وہ اندرونی خود مختاری کے متعلق شیخ صاحب کے موقف سے ہم آہنگ ہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو میرے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کیونکہ کشمیری عوام کی جدوجہد، ان کی اُمنگوں اور آرزؤوں کا سمبل شیخ عبداللہ ہیں۔ مرزا محمد افضل بیگ یا غلام محی الدین قرہ نہیں۔ جہاں تک مجھے شیخ صاحب کے خیالات تک رسائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ریاست کیلئے ۴۷ء والی پوزیشن سے کم کوئی حیثیت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ ابھی تک گونج رہے ہیں، جو چند دِن قبل میرے دِلّی سے روانہ ہوتے وقت اُنہوں نے مجھ سے کہے تھے۔

''میں کسی قیمت پر کشمیری عوام کی عزّت و آبرُو کا سودا نہیں کروں گا۔ اگر سب لوگ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں اور مجھے تن تنہا یہ جدوجہد کرنا پڑے، تو بھی میرے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئے گی، میں اِس جدوجہد میں اپنی موت کو ہزار سال کی زندگی پر ترجیح دوُں گا۔ میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا۔ لیکن مجھے اِس بات کا یقین ہے کہ کشمیر کو عزّت اور آزادی کا منصب حاصل ہو کر رہے گا۔

میں اپنے قارئین اور کشمیری عوام کو اِس ذہنی صدمے کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں کہ مستقبل قریب میں کشمیر کے ظلمت کدے میں روشنی کا کوئی امکان

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مجھے نظر نہیں آتا۔ ہندوستان کی حکومت اور لیڈر پاکستان پر اپنی فتح کے نشے میں اِس درجہ سرشار اور مغرور ہیں کہ انہیں نہ کشمیری عوام کے دکھ درد کا احساس ہے اور نہ اِس سے وابستہ تلخ حقائق کا۔

کشمیری عوام کو جُمہوریہ ہند میں اپنا صحیح مقام اور منصب پانے کے لئے اپنی جدوجہد ابھی بہت عرصے تک جاری رکھنا پڑے گی۔ اور میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے عوام اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں گے بشرطیکہ ہم صحیح طور پر ان کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کر سکیں۔

......☆......

(۳۱ رمئی ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مِسز گاندھی کی قیادت

میں شروع میں ہی اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ میں مِسز اندرا گاندھی کا مداح ہوں۔ انکی ہمت، قوت و فیصلہ اور رہنمایانہ صلاحیتوں کا معترف ہوں، اور اِن سے شدید سیاسی اختلافات کے باوجود انہیں کامراج، مرارجی ڈیسائی اور ایس کے، پاٹل جیسے برخود غلط سیاسی طالع آزماؤں کے مقابلے میں ہزار بار ترجیح دیتا ہوں، پچھلے تین چار برسوں میں مِسز گاندھی نے اپنی طاقت اور جماعت کو مستحکم بنانے کے لئے جس حِکمت عملی سے کام لیا، اِس نے انہیں اپنے ملک میں ہی نہیں، بیرونی دنیا میں عزت و توقیر بخشی ہے اور اِس وقت انہیں۔۔ بجاطور پر دُنیا کی طاقتور ترین خاتون کہا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ان کی طاقت اور وقار میں کئی گُنا اضافہ ہوا ہے۔ اور ریاستی اسمبلیوں کے حالیہ چناؤ میں کانگریس کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ یقیناً مِسز گاندھی کی ذاتی۔۔۔ شہرت اور مقبولیت کا ہی نتیجہ ہے، یہ بات ان کے حق میں کہی جاسکتی ہے، کہ سیاسی فتوحات کے اعتبار سے انہوں نے اپنے والد پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی فوقیت حاصل کی ہے اور بہت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے لوگ پنڈت جی کے مقابلے میں ان کی صاحبزادی کو بہتر سیاستدان اور کامیاب حکمران قرار دینے لگے ہیں۔ موجودہ صدر وی، وی، گری کے انتخاب سے لے کراب تک مسز گاندھی کو قدم قدم پر جو کامیابی نصیب ہوئی ہے، اِن کی بنا پر پارٹی اور حکومت دونوں ہی پر ان کا مکمل قبضہ ہوگیا ہے اور شری جگ جیون رام اور وائی، بی چوان جیسے پہلوان بھی ان کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں رکھتے، مسز گاندھی کا سب سے قابلِ تعریف کارنامہ یہ ہے کہ کہ انہوں نے جن سنگھ جیسی زہریلی فتنہ انگیز اور شر آمیز جماعت کو ایک سیاسی قوت کے طور پر ختم کردیا ہے، اور مرکز میں حکومت بنانے کا خواب دیکھنے والے جن سنگھی سورما دہلی کی میٹروپولٹین کونسل کے انتخاب میں بھی اس بُری طرح پِٹ گئے کہ اب ان کا سیاسی جغرافیہ دریافت کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ مسز گاندھی کے وزارت داخلہ کا چارج سنبھالنے کے بعد سے فرقہ وارانہ فسادات بالکل ختم تو نہیں ہوئے ہیں ،لیکن ان کی تعداد میں حیرت انگیز کمی واقع ہوئی ہے۔ بحیثیت مجموعی ملک سیاسی استحکام اور اندرونی امن وامان کی ایک اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ اور اس کا سہرا یقیناً مسز گاندھی کے سر رہے گا، کہ جنہوں نے کانگریس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ایک تجربہ کار ملاح کی طرح کنارے سے لگا کر غرق ہونے سے بچالیا، لیکن یہ صرف تصویر کا ایک رُخ ہے!

اپنی طاقت بڑھانے اور ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرنے کے لئے مسز اندرا گاندھی نے جو طریقے اور ذرائع اختیار کئے۔ بدقسمتی سے وہ ہمیشہ قابلِ تعریف یا قابلِ تقلید نہیں تھے۔ انہوں نے بھلے ہی اپنی اور اپنی جماعت کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

طاقت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہو، لیکن اُنہوں نے ملک کی اخلاقی اساس کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے۔ ان کے دورِ اقتدار میں ملک میں سیاسی استحکام تو پیدا ہوا ہے، لیکن جمہوری اداروں کی توقیر گھٹ گئی ہے۔ اُنہوں نے ملک کو پہلے سے مضبوط ضرور بنا دیا ہے، لیکن نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے، اور وہ اپنے آپ کو کسی اِخلاقی ضابطے یا نظریاتی موقف کا پابند نہیں سمجھتیں اور اِس لئے اُنہوں نے اپنی طاقت کو ہمیشہ صحیح طور پر استعمال نہیں کیا ہے، یہ کہنا بجا ہوگا کہ مِسز گاندھی نے ایک نئی اخلاقیات کو جنم دیا ہے اور اِس ضابطہ اخلاق کی رو سے ہر وہ اقدام جائز ہے کہ جس سے اپنے مخالف یا اِس کی سیاسی طاقت کو ختم کیا جا سکے۔ جھوٹ، مصلحت پسندی اور ریاکاری کو سیاسی لغت میں ہمیشہ حکمت عملی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن مِسز گاندھی کے دور میں ان الفاظ کو ایک نئی عزت RESPECTABILITY مِل گئی ہے اور کانگریس کے اندر اور باہر وفاداروں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی ہے جو ہر جھوٹ کو حق وصداقت کا حرفِ آخر ماننے اور منوانے پر مُصر ہے۔ جواہر لعل کے دورِ اقتدار میں خود کانگریس کے اندر نقادوں اور نکتہ چینوں کی ایک ایسی بااثر جماعت موجود تھی کی جو پنڈت جی سے مرعوب ہوئے بغیر بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں کرتے تھے۔ لیکن اِندرا جی کے دور میں صرف پارلیمنٹ میں ہی اپوزیشن کا خاتمہ نہیں ہوا، بلکہ کانگریس کے اندر بھی کِسی لیڈر میں یہ دم نہیں رہا کہ وہ زور سے سانس لے سکے۔ اگر کِسی پر یہ شُبہ ہوجائے، کہ اِسے لیڈر کے نکتہ نظر سے اختلاف ہے تو دوسرے دن اس کی لاش۔۔ (سیاسی لاش) کسی تالاب (سیاسی تالاب) میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

تیرتی ہوئی نظر آجائے گی۔ اِس صورتِ حال نے مِسز گاندھی کو عملاً ایک ڈکٹیٹر بنا دیا ہے اور وہ قدرتی طور پر اپنی طاقت سے بھرپور استفادہ کر رہی ہیں۔ مرکز میں اپنی طاقت کو مستحکم بنانے کے بعد اُنہوں نے ہر ریاست میں اپنی پسند کے وزراءِ اعلیٰ مقرر کر دئے ہیں، اور جہاں جہاں انہیں کسی وزیر اعلیٰ کی وفاداری پر ذرا بھی شُبہ تھا وہاں اُسے چھٹی کر کے کسی وفادار اور تابعدار کو تعینات کیا گیا ہے، اس طرح انہوں نے ریاستوں کی اندرونی خود مختاری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ مِسز گاندھی کو کسی نظریاتی موقف سے وابستگی نہیں اور اس لئے اُن کا کام بھی زیادہ آسان بن گیا ہے۔ انہوں نے بنگال میں کمیونسٹوں اور کیرالہ میں مُسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی، ان کے لئے تامل ناڈو کی نیم علیحٰدگی پسند جماعت ڈی، ایم، کے ساتھ انتخابی مفاہمت بھی قابل اعتراض نہیں، اور ضرورت پڑنے پر کِسی بھی اتحاد یا گٹھ جوڑ کے لئے تیار ہیں۔ وہ سوشلزم اور غریبی ہٹاؤ کے نام پر اپنے لئے ووٹ حاصل کرتی ہیں، لیکن ووٹ حاصل کرنے کے لئے ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں سے روپیہ حاصل کرنے میں انہیں کوئی عار نہیں۔ جواہر لعل کے دور میں بھی سیاسی بے ضابطگیاں اور اخلاقی فروگذاشتیں ہوتی تھیں۔ لیکن اِن بے راہ رویوں کو کبھی اخلاقی ضابطے کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ مِسز گاندھی کے دور میں ہر چیز جائز سمجھی جانے لگی ہے اور ہر بے ایمانی اور بدعنوانی کے لئے سیاسی اور اخلاقی جواز تراشے جاتے ہیں۔ ہر روز نئے نعرے ایجاد ہوتے ہیں۔ اور نعروں کے اِس غُل غپاڑے میں اولاً تو حق بات کہنے کا کِسی کو حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ابھی تک سچی بات کہنے کا دم خم باقی بھی ہو، تو اس شور شرابے میں اس کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ بنگلہ دیش کے معاملے میں مِسز گاندھی اور اُن کی حکومت کی نیت کچھ بھی رہی ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے موقف کو انسانی اور اخلاقی عظمت حاصِل تھی۔ اور اِسی لئے تمام دنیا نے ان کی کوششوں اور کاوشوں کو سراہا۔ انہوں نے جس تدبُر اور دانائی سے اس سیاسی مسلے کے انسانی پہلوؤں پر زور دیا۔ اِس سے ان کے موقف کو ساری دُنیا کی تائید حاصل ہوگئی۔ لیکن بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد انہوں نے وہاں کی غیر بنگالی آبادی پر توڑے جانے والے مظالم کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نِکالا۔ یہی نہیں، کہ انہوں نے ان مظلوموں سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ مِسز گاندھی نے ہمدردی اظہار کرنے والوں کو طعنے اور کوسنے بھی دئے، اپنی کچھ تقریروں میں انہوں نے بہاریوں پر توڑے جانے والے مظالم کا جواز مہیا کرنے کی بھی کوشش کی، اس طرز عمل سے صِرف یہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مِسز گاندھی انسانی جذبات یا اخلاقی لوازمات کے مقابلے میں سیاسی مصلحات کو ترجیح دیتی ہیں۔ اور ان کا یہ ذہنی رویہ سب سے زیادہ کشمیر کے معاملے میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ بنگلہ دیش میں جمہوریت کے قتل پر خُون کے آنسو بہاتی ہیں، لیکن کشمیر میں جمہوریت کے قاتلوں پر پھول برسانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ وہ ویت نام کے کچھ لوگوں کو جمہوری طریقوں سے اپنی حکومت بنانے کا حق دینے کے لئے ساری دُنیا کو متحرک ہونے کا درس دے رہی ہیں۔ لیکن اپنے ہی ملک کے ایک حصے میں جمہوریت کی بحالی کے لئے کوئی قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں۔۔۔ جواہر لعل اور شاستری جی کے دور میں بھی کشمیر

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں جمہوریت کے قتل کے خلاف پارلیمنٹ یا اس سے باہر آوازیں اُٹھتی تھیں، لیکن مِسز گاندھی کی مہربانی سے اختلاف اور انقلاب کی ہر آواز دب کر رہ گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جُوں جُوں ہندوستان کی جسمانی صحت ٹھیک ہوتی جا رہی ہے، اس کی روحانی حیثیت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔۔ مِسز گاندھی کے دورِ اقتدار میں ہمارا ملک سیاسی طور پر کافی فربہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی وہ اخلاقی حیثیت اور برتری ختم ہوگئی ہے کہ جس کو قائم کرنے کے لئے جواہر لعل نہرو نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اِس منصب سے ہندوستان کو نیچے اُتارنے کا فریضہ خود اُن کی صاحبزادی نے انجام دیا ہے۔

آج ہندوستان میں سیاسی اخلاقیات کا یہ عالم ہے کہ پارلیمنٹ میں کوئی ممبر شیخ محمد عبداللہ کی جلاوطنی کے خلاف آواز بُلند کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، کسی ممبر میں یہ طاقت اور جرات نہیں کہ کشمیر میں اِنتخابات کے نام پر ہونے والے فراڈ کے خلاف صدائے احتجاج بُلند کرے۔ کانگریسی ممبروں سے اس قسم کی توقع رکھنا بے کار ہے، لیکن حزب مخالف سے تعلق رکھنے والے ممبروں میں بھی کشمیر کے معاملے میں حق بات کہنے کا حوصلہ نہیں اور جب کبھی میں کشمیری عوام کے حقوق کا مطالبہ کر کے اُن پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذِکر کرتا ہوں، تو کانگریس کے اکثر ممبران آسمان سر پر اُٹھا کر میری آواز دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ شور مچانے والے ان وفاداروں میں بمبئی کے صالح بھائی عبدالقادر ہی نہیں، بارہ مولہ (کشمیر) سے منتخب ہونے والے آغا سعید احمد بھی شامل ہوتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حیلہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مِسز گاندھی کے دور میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سیاسی اخلاقیات کا کوئی تصور باقی نہیں رہا ہے۔اب ہر وہ چیز جائز ہے جسے مسز گاندھی جائز سمجھتی ہوں، اور ہر وہ چیز ناجائز، جسے وہ ناجائز قرار دیں اور وہ چونکہ مطلق العنان ہونے کی حد تک بااختیار ہیں، اس لئے ان کے دعوں کو جھٹلانے کی کسی میں ہمت نہیں! مسز گاندھی کا یہ طلسم کب تک باقی رہے گا؟ ان کے دوست اور دشمن دونوں ہی یہ سوال پوچھنے لگے ہیں، میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی، خود کانگریس کے اندر کچھ باضمیر لوگوں نے اِس اخلاقی زوال اور انحطاط کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے اور مستقبل قریب میں اس سوچ کا نتیجہ ٹھوس شکل میں برآمد ہونے کا امکان ہے۔ اندرا گاندھی کی قیادت نے ملک کو کچھ قابلِ ذکر فتوحات سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ مسز گاندھی نے مہاتما گاندھی کے خوابوں کا ہندوستان بہت حد تک مسمار کر دیا ہے ہم اقوام عالم کی صف میں ایک مضبوط قوم ہی نہیں ایک بُلند اخلاق، باضمیر اور باکردار ملک کی حیثیت سے بھی اپنی جگہ پانا چاہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسز گاندھی کے لئے اس قسم کے تصورات غیر متعلق اور لغو ہیں، کیوں کہ ان میں نہ گاندھی کی روح ہے اور نہ جواہر لعل کا ذہن۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہندوستان مسز گاندھی کے باوجود اپنے صحیح منصب کو پانے کے لئے آگے بڑھے گا۔ مسز گاندھی نہیں رہیں گی، لیکن ہندوستان قائم رہے گا۔ مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے ایمان و ایقان کی یہی روشنی، راستہ دکھا رہی ہے!

(۲۳ رمئی ۱۹۷۲ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا

کشمیر کے کانگریسی لیڈر آجکل باقاعدہ دو محاذوں پر لڑ رہے ہیں۔ ایک محاذ وہ ہے، جہاں پاکستان اور ہندوستان کی فوجیں آتش و آہن کے تمام تباہ کُن ہتھیار لیکر ایک جہنم برپا کرنے کے لئے آمنے سامنے صف آراء ہیں اور کوئی معمولی سی چُوک برصغیر بلکہ سارے ایشیا کے لئے غارت اور ناش کے ناقابلِ بیان دہانوں کا مہنہ کھول سکتی ہے۔ یہ صورت حال اتنی گھمبیر ہے کہ ہند اور پاکستان ہی کیا ساری دُنیا کی نظریں ان سرحدوں کی جانب وحشت اور تشویش کے ساتھ مرکوز ہوگئی ہیں۔ ہمارے کانگریسی لیڈروں کو سرحدوں کی اس صورت حال پر اگر فکر ہے، تو اسے بجا اور برمحل کہا جاسکتا ہے۔ لیکن کانگریسی رہنماؤں کی ساری طاقتیں چونکہ جنگ کے ایک دوسرے محاذ پر کار آزما ہیں۔ اسلئے پاکستانی جارحیت کے بارے میں اُن کی لن ترانیاں نہ صرف اصل جنگ کی پسپائیوں اور پیش قدمیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ہیں، بلکہ ان کا سیدھا سیدھا مقصد اندر کی اِس جنگ میں اپنی اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانا ہے۔ ہوا میں مکے لہرانے اور الفاظ کی توپیں داغنے کا مقصد حب الوطنی کے جذبے کے علاوہ مناسب حلقوں کو اپنی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

وفاداریوں کا اطمینان بھی دلانا ہے۔ اور اندر کی جنگ کے روزمرہ نقصانات کی تلافی کر کے اپنے اپنے دستوں کا حوصلہ بُلند رکھنا ہے۔ جہاں تک اس محاذ پر کاروائی کا تعلق ہے، چونکہ اس کی نقل وحرکت منظر عام پر ہے۔ لہٰذا مشاہدے کے بعد عام مبصر بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے، کہ اس معرکے میں خواجہ غلام محمد صادق کا پلہ بھاری رہا ہے، اگرچہ وزیراعلیٰ کی حیثیت سے انہیں بات کرنے اور گھومنے پھرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں، لیکن اپنی طویل علالت کے بعد انہوں نے اگلے علاقوں کا دورہ کرنے اور سخت بات کہنے کا جو اسلوب اپنایا ہے، اُس سے اُن کے دشمن صرف حیران ہی نہیں ہوئے ہیں، بلکہ وہ سناٹے میں بھی آگئے ہیں۔ اور اب اُن کا یہ اندازہ غلط ثابت ہو رہا ہے، کہ ۷۲ء میں ایک بیمار وزیراعلیٰ کی حیثیت سے وہ انتخاب کے شطرنج کے ٹورنامنٹ میں ایک سنجیدہ اور طاقتور شاطر کی حیثیت سے دادِ شجاعت نہ دے سکیں گے۔ یہ الیکشن کا ذکر ہمیں کانگریسی لیڈروں کے اصل پانی پت کی طرف لے آتا ہے۔ اگرچہ سارے مطلع پر جنگ کے گھنگھور بادل چھائے ہوئے ہیں، لیکن ریاستی کانگریس کے دونوں دھڑے فروری ۱۹۷۲ء کے تصادم کے لئے کسی تغافل اور بے احتیاطی کو جگہ نہیں دے رہے ہیں، بلکہ ابھی سے اپنی صفوں کو مکمل ''لیڈ ھ'' کے لئے کیل کانٹوں سے لیس کر رہے ہیں۔ یہ بات اب ریاستی سیاست کا فرسودہ راز بن گئی ہے، کہ کانگریس کی اس جنگ کا آغاز ۱۹۶۷ء کے الیکشن کے فوراً بعد کابینہ کے اعلان کے ساتھ ہی ہوا تھا، اس کے بعد فریقین نے وقت وقت پر پینترے بدل بدل کے ایک دوسرے پر دھاوے بول دئے اور گذشتہ پانچ برس میں میدانِ جنگ کا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پانسہ کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف پلٹتا رہا لیکن حتمی طور پر غلبہ صادق صاحب کو ہی حاصل رہا اور اس میں سب سے زیادہ دخل اس بات کو ہے، کہ نئی دلی نے ایسا چاہا۔ لیکن قاسم گروپ کی حیات کے لئے بھی اُسی سرچشمۂ حیات کے زندگی بخش فیض کو ہی دخل حاصل ہے۔ آخر کار دونوں گروہ اسلئے جلدی جلدی اقتدار کے قلعے کے اندر چلے گئے، تا کہ ۷۲ء کی فیصلہ کُن لڑائی وہیں سے لڑی جا سکے۔ کابینہ میں قاسم صاحب کی شمولیت کے بعد اس جنگ میں کمی کی جو پیشگوئیاں کی گئی تھیں، وہ غلط ثابت ہو چکی ہیں، اور اس کے برعکس اس نے جلتی پر تیل کا کام دیا ہے۔ فروری میں پڑنے والے گھمسان کے رن سے قبل دونوں فریق لڑائی کے ابتدائی مرحلوں کے لئے زور آزمائی میں مصروف ہیں۔ اور سب سے بڑی توجہ اس بات پر مرکوز ہے، کہ دونوں فریق اپنے اپنے پنج ہزاریوں کے لئے کانگریسی منڈیٹ کا دافع ہر بلا تعویز حاصل کر سکیں۔ منڈیٹ حاصل کرنے کو اس جنگ کا فیصلہ کُن مرحلہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ کشمیر میں الیکشن کی جو روایت قائم ہے۔ اُس کے مطابق منڈیٹ ملتے ہی امیدوار کو اس بات کی نوے فیصد گارنٹی مل جاتی ہے، کہ اب ووٹروں کی کچھ نہیں چلے گی۔ اور اُسے اُن کی گردن پر سوار کرنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ آزمایا جائے گا۔ تازہ اطلاعات کے مطابق ۷۰ء کے مارچ کی یاد صادق صاحب کے ذہن سے محو نہیں ہو سکی ہے اور اسی لئے وہ حریف پر کاری ضرب لگانے کے لئے مُصر ہیں، کہ کم از کم پچاس فیصدی ممبرانِ اسمبلی کو کوارٹر فائنل میں ہی چلتا کر دیا جائے، اور ان کی جگہ نئے چہروں کو منڈیٹ دئے جائیں، جن کی وفاداریوں کے متعلق موجودہ وثوق کی فضا قائم نہ رہے۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جس شدت سے صادق صاحب اِس انقلاب کے لئے ڈٹ گئے ہیں۔ اُسی شدت سے قاسم تریلوچن گروپ اپنے جہاں دیدہ غازیوں کو برقرار رکھنے کے لئے مزاحمت دکھا رہا ہے۔ اور اسی لئے جب دونوں گروپوں کے لیڈر دن بھر پاکستانی جارحیت کو للکارنے کے بعد اپنے اپنے حلقہ احباب میں پہونچ جاتے ہیں تو وہاں اصل میدان میں مہروں کی تازہ ترین ترتیب اور اگلی چال چلنے کے لئے نیم شبی کا روغن جلاتے ہیں، اگرچہ منڈیٹ کا معرکہ بے حد صبر آزما ہے، لیکن یہ جنگ کی انتہا نہیں ہے۔ دونوں گروپ ابھی سے اس امکان کا جائزہ بھی لے رہے ہیں، کہ منڈیٹ کے بعد بھی وہ اپنے اپنے ناپسندیدہ امیدواروں کو پٹخنی دینے کے لئے کیا کیا حربے آزما سکتے ہیں۔ کبھی کبھی عوام کے پر خشم چہروں کی طرف دیکھ کر دونوں ایکدم سہم جاتے ہیں اور چند لمحوں کے لئے اس نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں، کہ دونوں کی بقا کا اصل راز اس میں مضمر ہے، کہ اصل حریف۔۔۔ یعنی کشمیری عوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر کے انتخابی فراڈ کے آزمودہ ہتھیار سے اُنہیں میدان سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن اندرونی تضادات اس حد تک بڑھ گئے ہیں، کہ اندھیرے کی اس دیوار میں ابھی سے چھوٹے چھوٹے شگاف نظر آنا شروع ہو گئے ہیں، جن کا فائدہ اُٹھا کر کشمیری عوام کے باشعور نمائندوں کے کچھ ہراول دستے فصیل کے اندر گھس کر اجارہ داروں پر شب خون مار سکتے ہیں۔

......☆......

(۱۵ر نومبر ۱۹۷۱ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ندامت یا گھبراہٹ

ہندوستانی لیڈر بار بار یہ بات دہراتے ہیں، اور اس اخبار نے بھی ہر بار اِس رائے کی تائید کی ہے، کہ پاکستان کی موجودہ ابتلاء کے ایک سب سے بڑے مصنف ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ مسٹر بھٹو نے اقتدار کی حور کے ساتھ کسی حریف کے کھٹکے کے بغیر ہی ''ہنی مون'' منانے کا خواب دیکھا تھا۔ پاکستان کے عام انتخابات کے بعد شیخ مجیب الرحمان اُس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چنانچہ ایک بوالہوس عاشق کی طرح بھٹو صاحب نے رقیب کو ہٹانے کے لئے لیلیٰ کے محل میں ہی آگ لگادی اور یحییٰ خان کے لئے ایسے حالات پیدا کر لئے، کہ وہ شیخ مجیب سے کوئی معنی خیز گفتگو رکھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک کے یہی رہنما جب اپنے ملک کے داخلی مسائل سے نپٹنے کی بات سوچتے ہیں، اچانک اُن میں بھٹو صاحب کی روح حلول کر جاتی ہے اور وہ ہر کسی ایسے مفید مکالمے پر پانی پھیر دینے کے لئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ جس سے statusqua میں تبدیلی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آنے کا اندیشہ ہو یا اُن کے خود غرض سیاسی مفادات پر چوٹ پڑنے کا امکان پیدا ہوتا ہو۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ دھمکیوں اور شرارت پسندی کی ایسی فضا تعمیر کی جاتی ہے، کہ جس میں کسی صاحب نظر آدمی کے لئے پہل کرنا مشکل ہی نہیں، ہلاکت خیز بھی بن جاتا ہے۔ خواجہ غلام محمد صادق اور مرزا محمد افضل بیگ کے درمیان گذشتہ دنوں دلی میں جو ملاقات ہوئی، وہ اس طرزِ عمل کا بڑا دلچسپ لیکن بے حد عبرت ناک نمونہ ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے، کہ اس بات چیت میں کن موضوعات کو چھیڑا گیا، اور کیا اتفاق یا اختلاف سامنے آئے، لیکن ہم قیافے کی بناء پر بھی یہ کہنے سے چوک نہیں سکتے، کہ صرف بیگ صاحب کے لئے الگ مکان کی فراہمی اس بات چیت کا واحد موضوع نہیں رہی ہوگی، بہر کیف۔ ملاقات کے موضوع پر بات کرنے سے پہلے اس کے پس منظر اور محل وقوع کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے۔ ملاقات ظاہر ہے، کہ بیگ صاحب کی درخواست پر ہوئی۔ ایک ایسے وقت ہوئی اور جب شیخ صاحب اور بیگ صاحب پابندی کی زنجیروں میں اسیر ہیں اور اُنہیں ذاتی اور سیاسی طور پر نہایت مظلومیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔ ملاقات کے وقت ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر توپوں کے دہانے خوفناک اژدہاؤں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ اور آتش و آہن کے خوفناک بادل کشمیر کے مطلع پر خونخوار انداز سے ہلاکت خیزی کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ پس منظر یہ تھا، کہ ریاست میں اسمبلی کے انتخابات میں صرف چند مہینے کا وقفہ رہ گیا تھا اور بیگ صاحب کے ذہن میں مشرقی بنگال کے وہ روح فرسا واقعات گھوم رہے تھے۔ جب شیخ مجیب الرحمان نے اپنے عوام کی ننانوے فی صدی اکثریت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کا اعتماد حاصل کر لیا، لیکن اس کے باوجود وہ علیٰحدگی پسندی کے تقریباً فرضی الزام میں کسی نامعلوم جگہ پھانسی کے سائے میں دن گذار رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملاقات میں ساری نفسیاتی اور واقعاتی برتری صادق صاحب کو حاصل تھی۔ ملاقات کشمیر گورنمنٹ کے ایک دفتر مین ہو رہی تھی اور بیگ صاحب کسی صورت میں صادق صاحب کے اغوا کا منصوبہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اس کے باوجود اس بات پر اتنا کہرام مچایا گیا، کہ صادق صاحب کو گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارنا پڑا، کہ میں نے بیگ صاحب سے صرف مکان کی بات کی ہے حاشا وکلا کسی اور معاملے کا ذکر تک نہیں آیا۔ ہم سمجھتے ہیں، کہ یہ احساسِ ندامت دراصل اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔ جس کی صادق صاحب جیسے آزمودہ کار سیاسی مدبر سے توقع نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ اگر دنیا صدر یحیٰی خان کو شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ بات چیت کرنے کا مشورہ دے سکتی ہے، تو صادق صاحب بیگ صاحب سے ملنے پر اس قدر نادم ،شرمسار اور پشیمان کیوں نظر آتے ہیں۔ کشمیر اور مشرقی بنگال کے حالات کا کسی سطح اور کسی پیمانے پر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ کشمیر کسی کے معاملے کی وہ گیرائی ہے۔ جو مشرقی بنگال کے مسائل کی ہے، لیکن اس سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ کشمیر کے معاملات کو زیادہ آسانی کے ساتھ گفتگو اور افہام و تفہیم کے ذریعے سلجھایا جا سکتا ہے، خاص طور پر تاریخ کا موجودہ مرحلہ ہر لحاظ سے اس مکالمے کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ اگر صادق صاحب نے واقعی بیگ صاحب کے ساتھ یہی بات چھیڑی ہے، تو یہ ندامت کا نہیں، تدبر کا مظاہرہ کرنے کا موقعہ ہے۔ کبھی کبھی سچے مُحبِ وطن رہنماؤں کو اپنے گرد و پیش کی تالیوں سے زیادہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مستقبل کے فیصلے پر نظر رکھنا پڑتی ہے اور کچھ غیر مقبول اقدامات اُٹھانا پڑتے ہیں۔صادق صاحب نے اگر واقعی تدبر کا یہ راستہ اختیار کیا ہے۔تو انہیں جرأت سے اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔اور اگر ابھی نہیں کیا ہے، تو انہیں فوراً یہ پہل کر لینی چاہئے۔ ان کا اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ مکالمہ پاکستانی حکمرانوں کی فسطائیت کو پوری اثر آفرینی کے ساتھ دنیا کے سامنے بے نقاب کر دے گا۔اور جو اثر ہمارا مبالغہ آمیز پروپگینڈا پیدا نہیں کر سکا ہے وہ خلوصِ نیت کا یہ مظاہرہ پیدا کر لے گا۔

......☆......

(۳۰/اکتوبر ۱۹۷۱ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر۔۔۔

نقلی پونڈوں کے سکینڈل کا انکشاف جتنا ڈرامائی ہے، اُسی قدر عبرت ناک اور تشویش ناک بھی۔ ڈرامائی اور حیرت انگیز اسلئے کہ اس چھوٹی سی وادی میں اتنے بڑے پیمانے پر اور اس چابکدستی اور ہوشیاری کا یہ فریب قائم ہو سکا اور جاری رہا۔ اس کی تفصیلات سُن کر تو ایسا لگتا ہے کہ جاسوسی ناولوں کے ماہر جعل ساز کشمیر میں اپنی جنت بسانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ عبرت ناک اس لئے کہ اس بھیانک حقیقت کا پردہ چاک ہونے سے ہماری سماجی زندگی کا گھناؤنا پن پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہو گیا ہے۔ اور یہ بات ابھر آئی ہے، کہ ہمارے سماج کی بظاہر پرسکون سطح کے نیچے جرائم اور بددیانتی کے کیسے کیسے جوالا مُکھی خاموشی سے پنپ رہے ہیں۔ اس سکینڈل سے جبہ و دستار پہنے ہوئے اُن شریفوں اور رئیسوں کی اصلیت بھی بے نقاب ہو گئی ہے۔ جن کے نورانی چہروں کو دیکھ کر عقیدت کی گردن خوانخواہ خم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ جن سے کچھ شریف اور شائستہ قدروں کا دامن وابستہ کیا جاتا تھا اور جنہیں ہر محفل میں سب سے نمایاں نشست پر جگہ دی جاتی تھی۔ لیکن پاکیزگی کی یہ مصنوعی نقاب سرک جانے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے بعد اِن چہروں کی سیاہی منظر عام پر آ گئی ہے اور یہ رئیس اور شریف رہزنوں سے بھی زیادہ بدمعاش اور بدکردار ثابت ہو گئے ہیں، جو بھولے بھالے لوگوں کا خون چوسنے کے لئے بھیانک سے بھیانک جُرم کو عبادت کی سی سنجیدگی عطا کرتے رہے ہیں۔

اس سکینڈل کا تشویش ناک پہلو یہ ہے، کہ سونے کے غیر معمولی لالچ، حرص اور ہوس نے کس طرح ہماری سماجی زندگی کو متاثر کر دیا ہے، اور سارا سماج کس طرح ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر اُس کے لئے کوئی بھی قیمت دینے کے لئے تیار ہے۔ سونے کا یہ لالچ دراصل ہمارے معاشرے میں اچھی قدروں کے کینسر کی نشانی ہے۔ اور اِس اندھا دھند دوڑ میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز مشکل بن گئی ہے۔ یہ بات یقیناً تسلیم کرنا ہوگی، کہ سونے کے اس سکینڈل کی کچھ ذمہ داری سونا ڈھونڈنے والے سماج کی بے صبری پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر سونے کے طلبگار اس قدر اندھے اور بے قرار نہ ہوتے، تو ہمارے ماہر اور تجربہ کار صرافوں کے تمام داؤ پیچ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ طلبِ زر کی اس بیماری کا حقیقی سبب دراصل ہمارے وہ بے نیاز اور بے ہودہ سماجی رسوم و رواج ہیں۔ جو خاص طور شادی بیاہ کے اردگرد گھومتے ہیں، لیکن اب پیدائش امتحان میں پاس ہونے، نوکری کا حکمنامہ ملنے، ترقی پا جانے، نیا مکان بنانے وغیرہ مواقع سے بھی منسلک ہو گئے ہیں۔ ان رواجوں نے ہمارے سارے معاشرے کو اندر اندر سے ہی کھوکھلا کر دیا ہے۔ اِس سماج میں عزت، رُتبے، خلوص اور محبت کی پیمائش کا بس ایک پیمانہ رہ گیا ہے۔ چمکتا ہوا سونا ظاہر ہے کہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اس مصنوعی بھرم کو قائم رکھنے کے لئے سماج کا ہر طبقہ اپنی اوقات کو بھول کر سونے کے پیچھے دوڑ رہا ہے اور سونے کی بھیڑ بھاڑ (gold rush) میں اصول ،اعمال، اقدار اور اخلاق بے بس لاشوں کی طرح روندے جا رہے ہیں۔ سونے کا تازہ سکینڈل اس بیماری کی جڑ کا نہیں، اس کی علامت کا نشان ہے۔ یہ خطرے کی ایک گھنٹی ہے، اور اگر ہم نے اب کی بار بھی اپنے گرد و پیش کا جائزہ نہ لیا، سماج کے اصلی ناسور کو یونہی رہنے دیا، تو نہ معلوم یہ عارضہ مستقبل میں کتنی اور قدروں کا تابوت ثابت ہوگا۔ اس سکینڈل نے ایک اور بار شدت سے اس بات کا اعلان کر دیا ہے، کہ رسوماتِ بد کی اصلاح کی سخت اور بیحد سخت ضرورت ہے۔ اس بارے میں سماج کے ہر ذمہ دار فرد پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن خاص طور پر مذہبی علماء اور سماجی انجمنوں کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑیگا۔ اگر ان علماء اور انجمنوں کے دعاوی میں واقعی خلوص اور لگن موجود ہے، تو اُنہیں اب دیوانہ وار شدت سے اصلاح کے کام میں جٹ جانا چاہیئے اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر سماج کے موجودہ دھارے کا رُخ موڑنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

دوسرے نمبر پر حکومت کی ذمہ داری آتی ہے، جن مجرموں کو پکڑا گیا ہے، اُن کو عبرت ناک سزائیں دیکر آئیندہ اس قسم کے خطرات اور بے ایمانی کی روک تھام ہونا چاہیئے۔ اِن مجرموں کے چہرے اگرچہ شرافت کی نقاب پہنے ہوئے ہیں، لیکن ان کے جرائم اسقدر سنگین نوعیت کے ہیں، کہ ان کے ساتھ معمولی بھی ردو رعایت انصاف اور دیانت کو برسرِ عام قتل کرنے کے برابر ہوگی۔ اس سکینڈل کو بے نقاب کرنے میں کشمیر پولیس نے جس مستعدی، چوکسی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اور ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔اُس کی داد نہ دینا انصاف کا خون ہوگا۔پولیس کی کارکردگی بلاشبہ ہر تعریف کی مستحق ہے۔اور اسی لئے سرینگر کے عام شہری سے لیکر ہندوستان کی وزیراعظم تک نے اُسے شاباشی دی ہے۔اس سلسے میں اُن افسروں کی امتیازی ذہانت اور جرات کا خاص طور پر ذکر کیا جانا چاہئے۔جن کی سرکردگی میں یہ کارنامہ انجام پایا۔افسروں نے ثابت کردیا ہے کہ ہماری پولیس فورس مین ایسے طباع، محنتی اور فرض شناس آدمیوں کی کمی نہیں، جو چاہیں تو پولیس کی اعلیٰ ترین روایات کی چوٹی کو چھو سکتے ہیں، لیکن اِس مرحلے پر تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کرنا بھی برمحل ہوگا۔اس وقت جبکہ پولیس کو چاروں طرف سے خراج تحسین ادا کیا جارہا ہے۔کچھ دلوں مین اور خاص طور پر عام شہریوں کے دلوں میں ایک شبہ آہستہ آہستہ اپنا سر اُٹھا کر موجودہ کیفیت کا نشہ ہرن کررہا ہے، اندیشہ یہ ہے، کہ جس طرح کچھ مدت کے شوروشغب کے بعد سیمنٹ سکینڈل، لکڑی سکینڈل، چرس سکینڈل کے سلسلے کے کچھ اور معاملوں کو فائلوں میں دفن کردیا گیا ہے۔اُسی طرح چند دنوں تک دادو تحسین کی اُجرت وصول کرنے کے بعد سونا سکینڈل کو بھی بستۂ فراموشی میں ڈالدیا جائے گا۔پچھلے ریکارڈ کو دیکھ کر یہ اندیشہ کوئی زیادہ بے بنیاد بھی معلوم نہیں ہوتا۔اور اسی لئے پولیس کی اچھی کارکردگی پر بھی عوام میں ایک سنکی (cynical) رویہ پیدا ہوگیا ہے۔چنانچہ پولیس جوں جوں زیادہ اچھل کود کرتی ہے، عوام کے ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی میں زہرخند کا اندازہ زیادہ گہرا ہوتا جارہا ہے۔عوام کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے پولیس کو اس مرتبہ زیادہ بہتر کارکردگی کا ثبوت دینا ہوگا۔اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

وہ جب ہی ممکن ہے کہ جب اس کیس کو بیچ دھارے چھوڑنے کی بجائے منطقی انجام تک پہونچایا جائے۔اور اس میں ماخوذ بدمعاش اپنے کیفر کردار سے ہمکنار کردئے جائیں۔لیکن اب کی بار پولیس کے قدم لڑکھڑانے کا خطرہ اس لئے اور زیادہ ہوگیا ہے، کیونکہ پولیس کا سامنا براہ راست زر اور زرفروش تاجروں سے ہے۔ چرس، سیمنٹ وغیرہ سے دامن بچالینا مقابلتاً آسان کام ہے۔لیکن سونا ہم سب کی کمزوری ہے۔اس کے علاوہ سونے کا دھندا چلانے والے ملزموں نے کچھ اس سطح پر پیسہ بٹورا ہے۔ کہ وہ اپنی بے گناہی کی سند خریدنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کے لئے ہر وقت آمادہ ہونگے۔پولیس کو اپنی لاج رکھنا ہو تو اسے اس آزمائش سے بعافیت نکل آنا ہوگا۔فی الحال تو غالبؔ کا یہ شعر ہی سارے دلوں کی کیفیت کا ترجمان ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
جانے کیا گذرتے رہے قطرے پہ گہر ہونے تک

معاملے کا ایک اور سنگین پہلو یہ ہے، کہ اس میں ہزاروں بے گناہوں کی جیبیں کٹ گئی ہیں۔اُن کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور انہیں تقریباً دن دھاڑے لوٹ لیا گیا ہے۔انصاف کا تقاضا یہی ہے، کہ ان سادہ لوح شہریوں کو ہر قیمت پر Compensate کیا جائے اس غرض کے لئے اگر بے ایمان صرافوں کی بڑی بڑی جائیدادوں کو نیلام بھی کرنا پڑے۔تو اس میں تامل نہیں کیا جانا چاہئے۔اس طرح سے انصاف کے حقوق بھی پورے ہوجائیں گے،اور مجرمین کی عبرت کا سامان بھی ہوجائے گا۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہم اس مرحلے پر پولیس اور متعلقہ تحقیقاتی ایجنسیوں کی توجہ اس بات کی طرف بھی مبذول کرانا چاہیں گے، کہ وہ پہلی کامرانی کے نشے میں یہ بات بُھول نہ جائیں، کہ انہوں نے صرف لڑائی جیتی ہے اور اگر وہ تھوڑے سے غافل بھی رہے، تو عدالت کے سامنے وہ جنگ ہار کر اپنے واٹرلو سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ ابھی اس کامیابی کو پائیدار بنانے کے لئے کافی محنت اور عرق ریزی کی ضرورت ہے۔ اس لئے عدالت میں چالان پیش ہونے سے پہلے کیس کی تیاری پر غیر معمولی توجہ دی جانی چاہیئے، تاکہ مجرم یہ قانونی موشگافیوں کے چور دروازے ڈھونڈھ کر بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

عموماً اچھے سے اچھے سرکاری کیس بھی مناسب توجہ اور محنت کی عدم موجودگی میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ کیس کا یہ حشر نہ ہوگا اور اس کو تیار کرتے ہوئے کسی سہل انگاری سے کام نہ لیا جائے گا۔

سونے کے اس سکینڈل کے سطح پر آجانے سے کچھ ناخوشگوار حقائق کی رونمائی ہوئی ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ سونے کی ذخیرہ اندوزی کے خلاف سرکاری اور سماجی سطح پر باقاعدہ مہم چلائی جائے۔ اس کے علاوہ بھولے بھالے دیہاتیوں کو چالاک شہری زرگروں اور زرفروشوں کے چنگل سے بچا لینے کے لئے کچھ ٹھوس تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ خود پولیس اس اطلاع کی راوی ہے کہ صرافوں نے سکینڈل کے طشت از بام ہونے کے فوراً بعد نئے ہتھکنڈے استعمال کر کے پرانی شراب کی فروخت کا بندوبست کر دیا ہے۔

(۱۵ر ستمبر ۱۹۷۱ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نئے حقائق، نئے تقاضے

ہندوستان اور پاکستان کی چودہ روزہ جنگ نے جہاں بہت سے مفروضے اور اندازے غلط ثابت کئے ہیں، وہاں کچھ نئی حقیقتوں کو جنم دیا ہے۔ بنگلہ دیش کا قیام اُن نئی حقیقتوں میں سب سے زیادہ اہم اور عہد آفرین حقیقت ہے۔ ۲۵ برس قبل آزادی کے نام سے جو المناک ڈارمہ کھیلا گیا تھا، اور جس کے نتیجے میں برصغیر کو مذہب کی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس سے پیدا شدہ تضادات اور توہمات نے اس فکر اور سوچ کو غلط ثابت کر دیا ہے، جس نے تقسیم کو ہر درد کا مداوا سمجھ کر ملک کے ٹکڑے کر دئے تھے۔ پاکستان کی شکست اور ہندوستان کی فتح نے برصغیر میں طاقت کا ایک نیا توازن پیدا کر دیا ہے۔ اور صرف چودہ دن کے مختصر عرصے میں طاقت، جمہوریت، شرافت، بہادری اور انصاف کے پرانے پیمانے بے کار اور غیر متعلق ہو کر رہ گئے۔ کل کا غدار (شیخ مجیب) آج ایوانِ صدر کا خصوصی مہمان ہے۔ مشرقی بنگال کے "مُٹھی بھر" علیحدگی پسند آج بنگلہ دیش کی قضا و قدر کے مالک بن گئے ہیں۔ اور ایک انچ کے لئے آخری دم تک لڑنے کا عہد کرنے والے فوجی افسر اور حکمران پاکستانی عوام کے عتاب سے بچنے کے لئے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ایک ہزار سال تک لڑائی جاری رکھنے والے پاکستانی سیاستدان (مسٹر بھٹو) مسندِ صدارت پر بیٹھتے ہی دوستی، دیرپا دوستی، اور مفاہمت کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ اور چودہ برس بعد بدقسمت پاکستان میں اقتدار عوام کو منتقل کرنے کے نئے عہد و پیمان باندھے جا رہے ہیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں، جو بظاہر نظر آ رہی ہیں، لیکن ان ظاہری تبدیلیوں اور انقلابات کی تہہ میں اس سے بھی زیادہ عظیم اور دوررس تبدیلیوں کے بیج پرورش پا رہے ہیں۔ اور مستقبل قریب میں جب یہ بیج پختہ ہو جائیں گے تو ان سے ایک نئے اور عظیم تر انقلابات کی کونپلیں پھوٹیں گی!

جنگ ایک بھیانک اور کریہہ خواب ہے اور اس کی تعبیر اس سے بھی زیادہ خوفناک اور ڈراونی ہوتی ہے۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں، اُجڑے ہوئے گھر، اپاہج بچے، بیوہ مائیں اور لٹی ہوئی عصمتیں، یہ سب جنگ کی ہولناک یادگاریں ہوتی ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ جنگ کسی مسئلے کو حتمی طور حل کرنے کی بجائے ایک نئی جنگ کا جواز مہیا کرتی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کے لیڈر حالیہ جنگ کی تباہیوں سے سبق سیکھ کر حقیقت پسندی، عاقبت اندیشی اور تدبُر سے کام نہ لیں، تو بہت جلد ہمیں ایک نئے امتحان اور ایک نئی آزمائش سے گذرنا پڑیگا! بالغ نظر اور جرأت مند قیادت کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے تجربات اور حال کے حادثات کو مستقبل کی تعمیر میں خام مواد کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

ایک فاتح کی حیثیت سے ہندوستانی لیڈروں کے لئے دائمی امن،

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دوستی اور باہمی تعاون کی باتیں کرنا آساں ہے، لیکن پاکستان کے نئے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جس حقیقت پسندی کا ثبوت دینا شروع کیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ بھٹو صاحب پاکستان کے زخم چاٹنے کی بجائے ان کے لئے مرہم تلاش کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ غالباً اسی لئے پچھلے ۲۵ برسوں میں پہلی بار پاکستان کے اقتصادی نظام کو درست کرنے کی سنجیدہ کوششیں شروع ہوگئی ہیں۔ بھٹو صاحب نے ہر مسئلے پر ہندوستان سے بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کرکے بالغ نظری اور دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور یہ ایک نیک شگون ہے۔ اگر چودہ روزہ خونریز جنگ کا یہ نتیجہ نکلے، کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے تمام متنازعہ مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ اور دیانتدارانہ کوششیں شروع کردیں، تو میں سمجھوں گا کہ یہ جنگ پائیدار امن کے لئے ایک معمولی سی قیمت ہے۔

حالیہ جنگ نے جہاں مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے تسلط سے آزاد کرکے ایک خودمختار بنگلہ دیش کے قیام کو ممکن بنادیا، وہاں خود مغربی پاکستان میں بھی جمہوری اداروں کی بحالی کے امکانات روشن ہوگئے ہیں۔ فوجی حکمرانوں اور جرنیلوں کی شرمناک شکست نے پاکستانی عوام کے دل سے ان کاغذی شیروں کی ہیبت ختم کردی ہے۔ اور وہ بجا طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں، کہ ان لال بجھکڑوں نے پاکستان کی سالمیت کو ہی نہیں، اس کے وجود کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ یہ پاکستانی عوام کے غیض وغضب ہی کا نتیجہ ہے کہ بھٹو صاحب نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی بڑے بڑے جرنیلوں اور کرنلوں کو بیک بینی و

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دو گوش نکال باہر کر دیا اور اس طرح پاکستان کی پیشانی سے ذلت اور ندامت کے داغ دھونے کا عمل شروع ہو گیا۔ صدر بھٹو کے بار بار اقتدار عوام کو منتقل کرنے کا عہد پاکستانی عوام کے اس نئے شعور کی علامت ہے، کہ جو اب کسی قیمت پر آمریت اور تاناشاہی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندوستان سے حالیہ جنگ میں ہزیمت نے بالواسطہ طور پر پاکستان کے عوام کے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیاں بھی توڑ ڈالیں، اور یہ اس جنگ کا سب سے صحت مند پہلو ہے۔

چودہ روزہ جنگ میں پاکستان کی ہزیمت نے جہاں پاکستان میں ایک نئی فکر اور سوچ کو جنم دیا ہے، وہاں ہندوستان کی فتح نے بھی اس کے لئے فکر و عمل کی کچھ نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ہندوستان نے یہ جنگ یقیناً اپنے علاقے کی توسیع کے لئے نہیں لڑی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ہمارا ملک یہ جنگ لڑنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں نے بالعموم اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے بار بار اِس بات کو دہرایا ہے، کہ یہ جنگ جمہوریت اور آمریت میں ایک فیصلہ کُن کشمکش کا نتیجہ تھی اور اس میں ہندوستان کی فتح، جمہوریت کی فتح اور پاکستان کی شکست کو آمریت کی شکست سمجھ لینا چاہئے۔ اس طرح ہندوستان نے اس جنگ کو ذاتی مخاصمت اور خود غرضی کی سطح سے اُٹھا کر ایک اصولی اور نظریاتی کشمکش کا منصب عطا کیا اور غالباً اسی لئے دنیا بھر کے عوام کی ہمدردیاں اس جنگ میں ہندوستان کے ساتھ تھیں۔ لیکن ہندوستانی رہنماؤں کو فتح کے نشے میں چور ہو کر اس ذمہ داری اور ان فرائض سے غافل نہیں ہونا چاہئے، کہ جو اس منصب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دوسرے ممالک میں جمہوریت کی لڑائی لڑنے والے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سورماؤں کواپنے ملک کے ہر حصے میں بھی جمہوریت بحال کرنے کی طرف توجہ دینا ہوگی تاکہ ان کے قول اور فعل میں تضاد کا احساس نہ ہونے پائے۔

بنگلہ دیش میں جمہوریت کی فتح ونصرت کا جشن منانے والے ہندوستانی رہنماؤں کو میں اس مرحلے پر یہ یاد دلانا چاہوں گا، کہ ہندوستان کے ایک حصے ریاست جموں وکشمیر کے عوام کو پچھلے ۲۵ر برسوں سے جمہوری حقوق اورشہری آزادیوں سے محروم کردیا گیا ہے۔اور آج جبکہ ہماری فوجوں نے ایک دوسرے ملک کے عوام کوفوجی آمریت سے نجات دلانے کے لئے بڑی بے جگری سے اپنا خون بہایا، ملک کے اس حصے میں ابھی جمہوریت کا چراغ روشن ہونے کی کوئی امید نظرنہیں آتی۔اس ریاست کے سرکردہ رہنما جلا وطن ہیں، اور آئندہ انتخابات کو بھی ایک بے رحم مذاق بنانے کی تیاریاں زوروشور سے جاری ہیں۔پاکستان کے ساتھ حالیہ جنگ نے کشمیر میں جمہوریت کی بحالی کے لئے ہندوستانی لیڈروں کوایک اور تاریخی موقعہ فراہم کیا ہےاور مجھے امید ہے کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھانے میں تحمّل سے کام نہیں لیں گے۔

پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی ذلت نے صرف پاکستانی عوام کی آنکھیں نہیں کھولی ہیں۔ کشمیر کے ان علیٰحدگی پسند اور پاکستان نواز عناصر کے ذہن کی کھڑکیاں بھی کھول دی ہیں کہ جواس انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک دن پاکستان شمشیر کی نوک سے کشمیر کوفتح کر کے ان کے خوابوں کو پورا کردے گا۔ان لوگوں کواس بات کا احساس، علم اور اندازہ ہوگیا ہے، کہ پاکستان کے لئے کشمیر کو بزور بازو فتح کرنے اتنا ہی ناممکن ہے، کہ جتنا کہ بنگلہ دیش کا مغربی پاکستان کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ساتھ دوبارہ مدغم ہونا۔ گھڑی کی سوئی پیچھے گھمائی جاسکتی ہے، لیکن تاریخ کی سوئی کبھی پیچھے نہیں مڑتی۔ اس نئے احساس اور حقیقت پسندی سے فائدہ اُٹھا کر کشمیر کے مستند لیڈروں سے باہمی مفاہمت اور گفتگو کا سلسلہ فوراً شروع کیا جانا چاہیئے۔ اور میں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں، کہ کشمیر کے لیڈر اور لوگ ہندوستانی وفاق کے اندر رہتے ہوئے مکمل اندرونی خودمختاری کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔ اور یہ ایک ایسا مطالبہ ہے، کہ اس کی معقولیت کو خود ہندوستانی رہنما بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ میں توقع رکھوں گا، کہ فتح کے نشے میں سرشار ہو کر ہندوستانی لیڈران حقائق اور اصولوں کو نظر انداز نہیں کرینگے، کہ جنہوں نے اس جنگ کو ناگزیر بنا کر ہندوستان کو میدانِ جنگ میں فتح بخشی۔ کشمیر کی بے چین روح اور اس کے زخمی وجود کو صرف جمہوریت کا مرہم مطمئن اور مندمل کر سکتا ہے۔

......☆......

(۷رجنوری ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بیگ پارتھاسارتھی بات چیت کی ناکامی

اوراس کے اسباب

مئی ۱۹۷۴ء میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے شیخ محمد عبداللہ کی ملاقات کے بعد یہ اُمید پیدا ہوگئی تھی، کہ دونوں رہنما بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر کشمیر کی موجودہ سیاسی الجھن کو حل کرنے کے لئے بامقصد اور فیصلہ کن اقدامات کریں گے، وزیر اعظم اور شیخ صاحب دونوں ہی نے ایک نئے باب کا آغاز کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، اور اِس سلسلے میں ابتدائی بات چیت کے لئے وزیر اعظم کی طرف سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور شیخ صاحب کی طرف سے میرزا محمد افضل بیگ کا نام تجویز کیا گیا اور سرینگر پہونچ کر شیخ صاحب نے حضوری باغ کے ایک بہت بڑے عوامی اجتماع میں اِس مجوزہ بات چیت کا اعلان کرتے ہوئے میرزا محمد افضل بیگ کو اپنا نمائندہ نامزد کر دیا۔ شیخ صاحب کے اس اعلان سے میرزا بیگ کی عزت افزائی تو ہوئی لیکن میری اطلاع ہے کہ وزیر اعظم نے اِس طرزِ عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور پارتھاسارتھی، بیگ بات چیت شروع ہونے سے پہلے ہی مسز گاندھی اِس معاملے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں سرد پڑ گئیں۔ مِسٹر پارتھا سارتھی اور میرزا بیگ کے درمیان سرینگر اور دہلی میں کئی ملاقاتیں ہوئیں، اور مسٹر پارتھا سارتھی نے کشمیری لیڈروں کے نُکتہ نظر کو سمجھنے کے لئے شیخ صاحب سے بھی تبادلۂ خیال کیا۔ لیکن ایک سال کے دوران میں یہ بات چیت ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکی، اور آثار و قرائن سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے، کہ اِس بات چیت کے آگے بڑھنے کا اب کوئی امکان بھی نہیں ہے۔ بیگ صاحب اور مسٹر پارتھا سارتھی کے درمیان سال بھر کی یہ ملاقاتیں ''نشتند و گفتند و برخاستند'' تک ہی محدود رہیں۔ اور سید میر قاسم کے الفاظ میں ''اس بات چیت کو دو قانون دانوں کی بحث سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔'' وزیرِ داخلہ مِسٹر ادما شنکر ڈکشت اور مسٹر کے۔ سی۔ پنت نے پارلیمنٹ میں پوچھے گئے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اِسے، پوچھ گچھ اور تحقیقاتی نوعیت'' کی بات چیت قرار دیا ہے اور بس! دوسرے الفاظ میں حکومتِ ہند نے کشمیری لیڈروں کے ساتھ ''باقاعدہ مذاکرات'' کے وجود کو تسلیم کرنے سے اِنکار کیا ہے اور بیگ پارتھا سارتھی مکالمے کو ایک وکیلانہ بحث سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مطلب یہ کہ کشمیر کی سیاسی اُلجھن حل ہونے کے امکانات آج بھی اتنے ہی تاریک ہیں جتنے آج سے ایک سال پہلے تھے۔ اور بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات اپنے انجام تک پہونچنے سے پہلے ہی ناکام ہوگئے ہیں۔ کشمیری لیڈروں اور نئی دہلی کے درمیان مفاہمت اور تعاون کی تازہ ترین کوششیں کیوں ناکام ہوگئیں؟ وزیراعظم اور شیخ صاحب کی ملاقات سے جو توقعات پیدا ہوگئی تھیں، وہ پوری کیوں نہ ہوسکیں۔ میرزا افضل بیگ اور مسٹر پارتھا سارتھی کی بات

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

چیت آگے کیوں نہیں بڑھ سکی؟ ۔ یہ کچھ اہم سوالات ہیں اور ملک بھر کا دانش ور طبقہ ان کے جوابات جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں مفاہمت اور مصالحت کی حالیہ کوششوں کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی پر عائد ہوتی ہے، اور بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات کے کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہونچنے میں جو امر سب سے زیادہ مانع رہا ہے، وہ وزیر اعظم کی سرد مہری اور بے التفاتی ہے۔ پارتھا سارتھی کو اپنا نمائندہ نامزد کرنے کے بعد مسز گاندھی نے کبھی ایک بار بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اِس بات چیت کی رفتار کیا ہے اور یہ کِس سمت میں جارہی ہے۔ اگر میری اطلاع صحیح ہے تو مسز گاندھی نے اپنے نامزد کردہ نمائندے سے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ بات چیت کا محور اور مقصد کیا ہونا چاہئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِسے صرف کشمیری لیڈروں کی مزاج پُرسی اور ان کی ''ذہنی صحت'' کا اندازہ کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور بس! سنجیدہ اور با مقصد مذاکرات کے لئے یہ رویہ ناموزوں ہی نہیں نامعقولانہ بھی ہے۔ دراصل مسز گاندھی یا کسی اور مرکزی لیڈر نے شروع سے ہی اِس بات چیت کو کوئی اہمیت دینے سے احتراز کیا اور بات چیت کے پہلے ہی دور میں مسٹر درگا پرشاد در نے سری نگر میں اخباری نمائندوں سے ایک غیر رسمی گفتگو کے دوران کِسی ''باضابطہ بات چیت'' کے وجود سے اِنکار کیا تھا۔ مسٹر در نے اِسے ایک عام شہری اور وزیر اعظم کے درمیان باہمی گفتگو کا درجہ دیکر اِس کی سیاسی اہمیت کو قطعی طور نظر انداز کر دیا تھا۔ اِس وقت کشمیری رہنما بجا طور پر مسٹر در کی اِس 'دخل در معقولات' پر خفا ہو گئے تھے۔ لیکن وقت نے مسٹر درگا پرشاد در کو صحیح اور ہمارے رہنماؤں کو غلط ثابت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کر دیا ہے اور جو بات میرزا محمد افضل بیگ کی سمجھ میں اب آ گئی ہے، وہ ڈی۔ پی صاحب کی سمجھ میں بہت پہلے آ گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود شیخ صاحب بھی اِس بات چیت کے انجام کے متعلق کبھی پُر اُمید نظر نہیں آئے۔ اور اُنہوں نے اِس کے نتائج کے متعلق کبھی، کسی خوش فہمی کا اظہار نہیں کیا۔ جبکہ بیگ صاحب ہر دوسرے ہفتے بات چیت کے کامیابی سے آگے بڑھنے کے متعلق بیانات جاری کرتے رہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہر وہ بات جو عام لوگوں کی سمجھ میں چھ ماہ پہلے آتی ہے، وہ بیگ صاحب کی سمجھ میں چھ ماہ بعد آتی ہے۔

نئی دہلی کے ساتھ کشمیری لیڈروں کے مذاکرات کی ناکامی کی یوں تو کئی وجوہات ہیں، لیکن اصل وجہ ہندوستانی لیڈروں کا کشمیری رہنماؤں پر عدم اعتماد ہے۔ اُن کے خیال میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے بدلے ہوئے موقف کے باوجود انہیں اقتدار و اختیار سونپنا ایک بہت بڑا خطرہ مول لینا ہے۔ مرکزی قیادت کے اس آمرانہ اور تحکمانہ رویے میں مسز اِندرا گاندھی کا وہ غرور بھی شامل ہے کہ جو انہیں پاکستان کے خلاف ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کامیابی نے عطا کیا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اِس وقت جبکہ پورے ملک میں ان کی قیادت کو کوئی چیلنج یا خطرہ لاحق نہیں، وہ شیخ محمد عبداللہ کے کسی مطالبے کو تسلیم کر کے اپنی کمزوری یا کمتری کا مظاہرہ کیوں کریں، اس کے علاوہ مسز گاندھی کے گرد ایسے "مفادِ خصوصی" کی بھی خاصی تعداد موجود ہے کہ جو کشمیر کے معاملے میں کسی نرم یا معقول رویے کو اپنی موت کے مُترادف سمجھتے ہیں۔ وہ براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ طور مسز گاندھی کی فِکر اور ان کے رجحانات کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کشمیری لیڈروں کی آواز اور ان کے مطالبات کونظر انداز کرنیکی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی پشت پر آج کوئی منظّم تحریک یا طاقت نہیں ہے۔ کئی سرکردہ ہندوستانی لیڈروں نے مجھے بتایا کہ اِس وقت جبکہ شیخ محمد عبداللہ سیاسی طور پر بے حد کمزور ہیں، اِن سے بات چیت کر کے اِس کے مطالبات کوتسلیم کرنا اِن کی کھوئی ہوئی سیاسی طاقت کو بحال کرنے کے مترادف ہوگا، اور مِسز گاندھی کبھی ایسی غلطی نہیں کریں گی۔ ملک بھر میں عام تاثر یہی ہے کہ کشمیری لیڈروں میں جدوجہد کرنے اور صعوبتیں برداشت کرنے کی طاقت ختم ہوچکی ہے۔ انہیں بڑھاپے نے مضمحل کردیا ہے۔ اِس لئے اِن سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے اُنہیں مزید تھکا دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ عملاً اپنی جدوجہد سے دست بردار ہوجائیں۔ یہ تاثر صحیح ہے یا غلط، اِس سے قطع نظر اِس بات میں کوئی شک نہیں، کہ کشمیریوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ نہ ان کی آواز میں وحدت کا تاثر ہے اور نہ ان کی قیادت میں وہ دم خم، اِس پس منظر میں کوئی ان کی بات سُنے بھی تو کیوں؟۔ آج پورے ملک میں آندھرا کے مسئلے کو اولین اہمیت حاصل ہے اور شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے میں مسٹر سباریڈی کو زیادہ توجہ سے سُنا جاتا ہے۔ کشمیر کے سوال کو ہندوستانی سیاست، صحافت یا پارلیمنٹ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ان حالات میں بیگ پارتھا سارتھی بات چیت کی ناکامی سے کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

اِس میں کوئی شک نہیں ہے، کہ شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی حقیقت کوتسلیم کر کے اپنی نیک نیتی، نیک عزائم اور ارادوں کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے دستاویز الحاق کی بُنیاد پر ریاست کی اندرونی خودمختاری کو بحال

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کرنے کا معقول مطالبہ کر کے ہندوستانی لیڈروں کو یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ کشمیر کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا ازالہ کریں لیکن صرف طاقت اور تشدد کی زبان سمجھنے والے ہندوستانی لیڈروں کے لئے مطالبات کی معقولیت اور انصاف کی دہائی کافی نہیں، وہ اِس وقت تک کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے کہ جب تک کشمیری عوام متحد ہو کر پوری قوّت کے ساتھ اپنی بات منوانے کے لئے جدوجہد کا آغاز نہ کریں، اِس جدوجہد کو نئے ڈھنگ سے، نئی بنیادوں پر منظّم کرنے کی ضرورت ہے اور اِس میں اِن سب لوگوں کو شامل کرنا پڑے گا جو ہندوستان میں ایک ترقی پسند، جمہوری نظام اور سیکولر معاشرے کا بول بولا چاہتے ہیں اور جن کی نگاہوں میں کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ دائمی تعلق جمہوری قدار کے استحکام کی ضمانت ہے۔ اِس نئی جدوجہد میں شیخ محمد عبداللہ، میرزا افضل بیگ، مولانا مسعودی، خواجہ غلام محی الدین اور دوسرے رہنماؤں کے علاوہ سید میر قاسم اور اِن کے بہت سے ساتھی بھی شریک ہوں گے۔ کیوں کہ یہ جدوجہد اِس جدوجہد کا تسلسل ہوگی جو ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی تھی اور جس نے ''نیا کشمیر'' کا روپ اختیار کیا تھا۔

......☆......

(۱۵/مارچ ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پھر آ گیا ہوں
گردشِ دوراں کو ٹال کر

''آئینہ'' کی اشاعت میں پچھلے چھ ماہ سے جو بے قاعدگی پیدا ہوگئی ہے، وہ میری عدم توجہی اور عدیم الفرصتی کا نتیجہ ہے، سرینگر سے مرکزی پارلیمنٹ کا رُکن منتخب ہونے کے بعد میرا زیادہ تر وقت دِلی میں گزرنے لگا اور اپنے نئے منصب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مجھے غمِ جاناں کے علاوہ غمِ دوراں سے بھی شناسائی کرنا پڑی۔ پچھلے سال کے آخر میں یوُرپ، امریکہ اور رُوس کی سیاحت پر جانے کا اتفاق ہوا، تو ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے سرینگر سے رابطہ ہی کٹ گیا، وطن لوٹے تو برصغیر کے آسمان پر جنگ کے خوفناک بادل چھائے ہوئے تھے اور بجلیوں کی گڑگڑاہٹ سے پوری فضا کانپ رہی تھی، پھر جنگ شروع ہوگئی۔ اور چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا۔ اس کشمکش میں فرصت اور ذہنی سکون کے وہ چند لمحے بھی کھو گئے، کہ جو ہر ہفتے ''آئینہ'' کی تخلیق اور تزئین میں صرف ہوتے تھے۔ دلی اور سرینگر کا فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ میرے لئے دِلی میں رہ کر ''آئینہ'' کی ترتیب و تدوین کا کام ناممکن بن گیا، میں نے حالات کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سامنے ہتھیار ڈالکر اپنے آپ کو اِس ذہنی صدمے کے لئے تیار کرلیا، کہ اب ''آئینہ'' کا اجراء میرے بس کی بات نہیں اور باقاعدہ طور اعلان کیئے بغیر ''آئینہ'' کو تقریباً بند کردیا۔ شروع شروع میں ''آئینہ'' کی موت کا غم ایک جانگسل ثابت ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ غم بھی گوارا ہونے لگا اور ہمیں یہ محسوس ہونے لگا، کہ دُنیا کا کاروبار ''آئینہ کے بغیر بھی جاری رہ سکتا ہے!

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
کیجئے ہائے ہائے کیوں روئیے زار زار کیوں

چھ ماہ کا یہ مختصر سا وقفہ میرے اور میری صحافتی زندگی کے لئے ایک انتہائی اہم اور نادر تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور آج جبکہ میں ''آئینہ'' کے احیاء نو کا آغاز کررہا ہوں، میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ میں نے ''آئینہ'' کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اِس کے پرستاروں، جاں نثاروں اور وفاداروں کی عقیدت اور ان کے جذبات کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا تھا، میں نے اِس حقیقت سے غالباً غیر شعوری طور پر، چشم پوشی کی تھی، کہ ''آئینہ'' صرف میری ہی نہیں، اِن ہزاروں پڑھنے والوں کی بھی ملکیت ہے جو پچھلے سات سال کے دوران اِس سے گرمی اور روشنی حاصل کرتے رہے ہیں۔ میں نے مصروفیات اور مجبوریوں کا بہانہ بنا کر ایک فِکری تحریک، ایک ذہنی رُجحان اور ایک صحافتی میلان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

میں نے اپنی سہولیت اور عافیت کے لئے ایک عظیم مقصد اور نصب العین سے غداری کی تھی۔ میں نے ''آئینہ'' کو بند کر کے ایک ذہنی اِنقلاب

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے امکانات کو ختم کر دیا تھا۔ اور میں ''آئینہ'' کے ان سینکڑوں پرستاروں کا ممنوں ہوں کہ جنہوں نے گذشتہ چھ ماہ کے دوران مجھے اِس جرم اور محرومی کا احساس دلایا، میں ''آئینہ'' کے اِس احیاءِ نو کو انہی ''آئینہ نوازوں'' کے نام ممنون کرتا ہوں! پچھلے چھ سات سال کے دوران اِس ریاست میں صحافت کو کافی فروغ ملا ہے، اب یہاں ایک دو نہیں درجن بھر روزنامے شائع ہوتے ہیں ہفتہ وار اخبارات بھی سینکڑوں کی تعداد میں جاری ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر ''آئینہ'' کی کمی کو اِس شدت سے محسوس کیا گیا، تو ظاہر ہے کہ ''آئینہ'' کسی خاص ضرورت کو پورا کرتا ہے، جو غالباً اِس یاست کا کوئی دوسرا صحیفہ نہیں کر سکتا، اصل بات یہ ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہونے والے اخبارات کا تعلق خبر سے ہے نظر سے نہیں ہے، ''آئینہ'' خبر کا نہیں نظر کا اخبار ہے۔ اور اِس کے لئے اہلِ نظر کو ''آئینہ'' کی گمشدگی سے بجا طور پر تشویش لاحق ہو گئی تھی، اپنی زندگی کے سات سال میں اِس اخبار نے خبروں کی اشاعت سے زیادہ نظریات کی تہذیب اور تبلیغ کا کام سرانجام دیا ہے، بصارت کے بجائے اپنے پڑھنے والوں کی بصیرت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ سنسنی خیزی کی بجائے فکر انگیزی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے اور مصلحت کے بجائے بغاوت سے کام لیا ہے۔ شخصیات سے زیادہ اقدار کی پرستش کی ہے اور مقدار کے مقابلے میں معیار کو ترجیح دی ہے۔ اِس اخبار کا ہر شمارہ ہمارے اس بیان کی تصدیق کرے گا کہ ''آئینہ'' نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی وقت کے فرعونوں کے ساتھ ٹکر لے کر اپنی شخصیت اور انفرادیت کو برقرار رکھا۔ وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے کی بجائے حتی المقدور تاریخ کے بہاؤ کو

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بدلنے کی کوشش کی۔ اِن کوششوں میں ہمیں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ اِس سے بحث نہیں لیکن ہمارے لئے یہ بات باعث اطمینان اور قابلِ فخر ہے کہ ہم نے ناسازگار موسمی حالات میں بھی حق وصداقت کا چراغ روشن رکھنے کی جسارت کی۔ ہم نے ایک بار بھی مصلحت یا مصالحت کا راستہ اختیار کر کے اپنی ذمہ داریوں سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی، اور یہی وجہ ہے کہ وہ درجنوں روزنامے اور سینکڑوں ہفت نامے بھی ''آئینہ'' کی کمی کو پورا نہ کر سکے۔

یہ رُتبہ بُلند مِلا جس کو مِل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

میں نے ذاتی طور ''آئینہ'' کی موت کا غم تو گوارا کر لیا تھا لیکن رفتہ رفتہ مجھے اپنی زندگی میں کِسی اہم شے کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اپنی تمام مصروفیات، اور دلچسپیوں کے باوجود، مجھے اپنی زندگی بے مقصد اور بے روح نظر آنے لگی تھی، اور میں ایک عجیب ذہنی اضطراب اور روحانی پیچ وتاب کا شکار تھا۔ مجھے اپنی شخصیت اور اپنا وجود دونوں ہی نامکمل دکھائی دے رہے تھے۔ میری روح کو ایک بے نام سی خلش اور کسک بے چین کئے ہوئے تھی۔ ''آئینہ'' کی حیاتِ نو کا یہ دوسرا دور اِسی خلش کی پیداوار ہے۔ میں اس بات کا اعتراف اور اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ پارلیمنٹ میں میری دھواں دھار تقریریں اور سیاسی اجتماعات میں میری خطابت ''آئینہ'' کا نعم البدل نہیں ہوسکتیں۔ میرا اصل مقام اور منصب صحافت ہے سیاست نہیں، میں سیاست میں بھی صحافت ہی کے دروازے سے آیا ہوں اور مجھے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اور اس کے لئے میں چھ ماہ کے طویلِ مختصر وقفے کے بعد پھر اپنی دنیا میں لوٹ رہا ہوں۔ مرکزی پارلیمنٹ کا منصب مسلم، لیکن ''آئینہ'' کی پارلیمنٹ کا مرتبہ بھی دُنیا کی کسی پارلیمنٹ سے کم نہیں۔

پچھلے چھ ماہ کے دوران دُنیا کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ ہماری ریاست میں بھی کچھ بہت بڑی تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں۔ ''آئینہ'' خواجہ غلام محمد صادق کے دورِ اقتدار کے ساتھ ہی طلوع ہوا تھا۔ اور اپنی زندگی کے چھ سات سال اس اخبار نے بڑی بے جگری اور علو ہمتی کے ساتھ کشمیری عوام کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ اور اِن کے جائز حقوق اور مفادات کی نگہداشت کا فریضہ انجام دیا۔ اور یہ بات خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ میری انتہائی سخت اور بعض اوقات تکلیف دہ تنقید کے باوجود انہوں نے کبھی تنگ نظری اور تنگدِلی کا ثبوت دیکر میرے یا میرے اخبار کے تئیں ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ زخم کھانے کے باوجود مُسکراتے رہے اور انہوں نے کبھی بھُولے سے بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ انہیں اِس بات کا احساس تھا کہ ''آئینہ'' ایک تاریخی فریضہ انجام دے رہا ہے اور اسی لئے انہوں نے کبھی اس تاریخی عمل کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ''آئینہ'' کی بے رحم تنقید سے بُری طرح مجروح ہونے کے باوجود ''آئینہ'' کی سالانہ تقریبات میں بڑے خلوص کے ساتھ شرکت کرتے۔ اور ایک بار میرے ایک انتہائی سخت اداریے پر اُنہوں نے اِن الفاظ میں اپنا ردِعمل ظاہر کیا تھا'' اے کاش! میں بھی اس بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا''۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آج صادق صاحب ہم میں نہیں ہیں، اور اِن کی جگہ اِن ہی کے ایک ساتھی سید میر قاسم نے لی ہے۔ قاسم صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ صادق صاحب سے زیادہ وسیع اُلقلب۔۔ جمہوریت نواز اور آزادی فکر کے قدر شناس ہیں۔ ہم ان کے اس دعوے کو "آئینہ" کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیں گے!۔

......☆......

(۱۵رمئی ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسئلہ کشمیر۔۔۔میری نظر میں

جموں وکشمیر میں کانگریس کی ''معرکہ خیز'' فتح کے کچھ ہی دن بعد ریاست کے وزیرِاعلیٰ سید میر قاسم نے دِلی میں اخباری نمائندوں سے کہا، کہ ''ریاست میں تازہ انتخابات سب سے زیادہ آزاد انتخابات تھے، جواب تک منعقد کئے گئے ہیں''۔قاسم صاحب کے بیان کے سچ یا جھوٹ ہونے سے قطع نظر، اس کا صاف مطلب یہ اعتراف ہے کہ اس سے پہلے کے انتخابات یا تو کم آزادانہ ورنہ بالکل ہی غیر آزادانہ تھے۔تازہ انتخابات کے نتائج کا جہاں تک تعلق ہے، جنہوں نے مِسز اندرا گاندھی اور قاسم صاحب دونوں کو اس قدر حُسنِ ظن میں مبتلا کردیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ یہ چناؤ نہایت ہی عجیب حالات میں منعقد کئے گئے۔شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفیق مرزا محمد افضل بیگ کو پچھلے سال پارلیمنٹ کے درمیانی عرصے کے انتخابات سے کچھ ہی پہلے کشمیر سے جلاوطن کردیا گیا۔دونوں لیڈروں کے داخلہ کشمیر پر اُس وقت بڑے بھونڈے انداز اور تعجل کے ساتھ پابندی لگائی گئی جب انہوں نے پارلیمانی چناؤ میں حصہ لینے کے ارادے کا اظہار کیا۔سترہ سال کی مسلسل سیاسی سرگرمی کے بعد (محاذ رائے شماری کی بنیاد ۱۹۵۴ء میں ڈالی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گئی تھی) مرکزی حکومت کو اچانک محاذ رائے شُماری کے غیر قانونی ہونے کا احساس ہوا۔ اور اِس جماعت کو غیر قانونی سرگرمیوں کے ایکٹ کے تحت خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے ان دونوں اقدامات کا موقع محل بجائے خود حکمران جماعت کے مقاصد پر بڑا معنی خیز تبصرہ ہے۔

شیخ صاحب اور بیگ صاحب کی مسلسل جلاوطنی اور محاذ رائے شماری پر پابندی کو ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں یقینی فتح کے لئے پوری ضمانت نہیں سمجھا گیا۔ کچھ سیاسی لیڈروں کی طرف سے حکمران کانگریس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں نے ریاستی حکومت کو اس حد تک خوفزدہ کر دیا، کہ دو نہایت نمایاں سیاسی لیڈروں مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ کو ۳ر فروری ۱۹۷۲ء کو گرفتار کیا گیا۔ اِس سے صرف دو دن قبل ریاستی گورنر نے نوٹیفکیشن جاری کیا تھا۔ جس کے ذریعے ریاستی عوام سے کہا گیا تھا، کہ وہ ریاست کی اسمبلی کے لئے اپنے نمائندے چُن لیں۔ اُن کی گرفتاری کے وقت الزام لگایا گیا، کہ یہ ایک بیرونی طاقت کے ساتھ سازش کر رہے تھے۔ انتخابات کے بعد اُن کی غیر مشروط رہائی خود اپنا ماجرا بیان کرتی ہے۔ بیگم عبداللہ کے داخلہ کشمیر پر ۳ فروری ۷۲ء کو پابندی اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کا خاتمہ بھی کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔۔۔ انتخابات سے اخراج کا عمل صرف جلاوطن اور گرفتاریوں پر ہی محدود نہیں رہا، اس کو اور بھی آگے لیجایا گیا۔

کاغذاتِ نامزدگی کی چھان بین کے وقت اُن تمام اشخاص کو جو سرکاری اُمیدواروں کے لئے اندیشے کا باعث بن سکتے تھے۔ کسی نہ کسی طریقے سے ہٹا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دیا گیا۔ کاغذاتِ نامزدگی کے مسترد کرنے کے معاملات کا مطالعہ ایک دلچسپ انداز کی نشاندہی کرتا ہے۔ کچھ سرکردہ کانگریسیوں، جن میں ایک منسٹر، دو ڈپٹی منسٹر بھی شامل ہیں کی شکست کشمیر سے باہر کچھ لوگوں کو تعجب انگیز معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن جانکار لوگوں کو اس سے دھوکہ نہیں لگ سکتا۔ یہ ایک کُھلا راز ہے۔ کہ یہ شکستیں بالکل اُسی طرح جان بوجھ کر ممکن بنائی گئیں، جس طرح سرکاری امیدواروں کی اکثریت کی کامیابیاں۔ جن لوگوں نے سرینگر، بارہمولہ اور اننت ناگ ضلعوں میں ہارا، اُن میں سے نوے فیصدی امیدوار وہ تھے، جنہوں نے ۱۹۶۷ء کے الیکشن کے بعد اقتدار کی کشمکش میں سید میر قاسم کے بدلے خواجہ غلام محمد صادق کا ساتھ دیا تھا۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ اس دیوانہ پن میں فرزانگی اور ہوشیاری کا بھی بڑا دخل تھا۔ ریاستی اور مرکزی حکومت کے پروپگینڈا باز اِس بات پر بڑے زور زور سے تالیاں بجا رہے ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ نے بائیکاٹ کی جو اپیل کی تھی، ریاستی عوام نے اُس کی پروا نہ کرتے ہوئے بھاری تناسب سے ووٹ ڈالے۔ یہ پروپگینڈا باز بار بار کہتے ہیں کہ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ شیخ صاحب الگ تھلگ ہو چکے ہیں اور کشمیری عوام کو اب اُن کی قیادت پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ یہ لوگ دلیل دیتے ہیں کہ علحیدگی پسندوں کی ساری جاذبیت ختم ہو چکی ہے۔ اور اسمبلی کے حالیہ انتخابات مسز اندرا گاندھی اور اُن کی جماعت کے لئے واضح منڈیٹ ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ان دلائل کا مخاطب کون ہے۔ اگر اُن کا رُخ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کی طرف ہے تو وہ اپنا منہ پھیر کر جواب دے سکتے ہیں۔ "اگر ہم الگ تھلگ ہو چکے ہیں، اگر کشمیر کے لوگ ہماری طرف کوئی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

توجہ نہیں دیتے، اگر کشمیر میں ہم کسی اثر ورسوخ کے مالک نہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اور ہمیں جلاوطن کرنے کا اختیار صرف انتخابات کے آغاز پر استعمال کیا جاتا ہے"۔ اس سال ۳ فروری کو بیگم عبداللہ کی جلاوطنی سے اس استفسار کا وزن اور بڑھ جاتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ دلیل نہ شیخ صاحب اور اُن کے رفقاء کی طرف مخاطب ہے اور نہ ہی اس کا اثر ریاستی عوام پر ہوسکتا ہے، کیوں کہ وہ ساری سچائی سے واقف ہیں۔ درحقیقت یہ دلیل ریاست سے باہر کی رائے عامہ کے لئے اختراع کی گئی ہے جس کو یہ باور کرایا گیا ہے، کہ ریاست میں جو کوئی بھی حکمران ٹولی کے خلاف ہے، وہ دراصل ہند کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے خلاف ہے۔ سچائی سے اور کوئی بات اتنی بعید نہیں، جتنی یہ بات ہے۔

کیا وجہ ہے کہ کشمیر میں اول سے ہی انتخابات میں فراڈ کیا گیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کے دورِ حکومت میں بھی ۱۹۵۱ء میں ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے لئے جو انتخابات کرائے گئے، اُس میں فراڈ کیا گیا؟ کیا وجہ ہے کہ جواہر لعل نہرو نے بخشی غلام محمد کو ریاست میں انتخابات کا سوانگ رچانے کی اجازت دی۔ اور پھر ان کی مدافعت کی؟ کیا وجہ ہے کہ غلام محمد صادق جیسے لبرل سیاستدان کو بھی ناجائز چناؤ کا حربہ آزمانا پڑا؟ کیا وجہ ہے کہ سید میر قاسم آزادانہ انتخاب کا سوانگ رچا کر برسر اقتدار آنے کی تحریص سے دامن نہ بچا سکے؟ یہ سب بڑے جائز سوالات ہیں، اور آج یا کل ان کا جواب ڈھونڈنا ہی ہوگا۔ اگر ہم ڈکٹیٹر شپ کے تحت یا کسی نگران جمہوریت کے تحت ہوتے تو جوابات بڑے آسان ہوتے۔ لیکن ہندوستان دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت ہے اور مجموعی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

طور ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ دُنیا کے اس حصے میں جمہوریت بہر حال قائم رہے گی۔ بنگلہ دیش کو ہم نے جو امداد دی، اُس سے ثابت ہو گیا ہے، کہ جمہوریت کے ساتھ ہمارا پیمان کس قدر پُر خلوص ہے، اور ہم جمہویت اور انسانی وقار کے بنیادی اصولوں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ یہ ساری باتیں کشمیر میں ہماری پوزیشن کو اور بھی عجیب بناتی ہیں۔ اگر ہم کشمیر کو جمہوریت نہیں دے سکتے، تو ہم دُنیا کے دوسرے حصوں میں جمہوریت کے غم گسار ہونے کا کیا جواز دے سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ملک کے ایک حصے میں آزادانہ انتخابات کے لئے تیار نہیں تو ملک سے باہر سیکولرازم اور جمہوریت سے متعلق ہمارے وعظ کون سُنے گا۔ اسی لئے کشمیر کے واقعات ہمارے ملک میں رائے عامہ کے لیڈروں کے لئے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ کشمیر میں جمہوریت اور سیکولرازم کے ساتھ ہمارا پیمان ۱۹۴۷ء کے وقت بلکہ اس سے بھی پہلے ہوا ہے۔ یہاں پر ان اصولوں کے متعلق ہماری غمخواری اتنی ہی گہری بھی ہونی چاہیئے، ہم نے کشمیر کے لوگوں کو آئین ہند میں درج شدہ بنیادی حقوق سے محروم کر کے انہیں برگشتہ خاطر کر دیا ہے۔ ہم کیونکر توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ الگ تھلگ رہنے کے اپنے رُجحان کو ترک کر کے قومی دھارے میں شامل ہو جائیں؟

پچھلے چوبیس سالوں میں ہم نے روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے، تاکہ ریاست اور باقی ملک کے درمیان جغرافیائی فاصلے کم کئے جا سکیں۔ لیکن کیا ہم نے اس عرصے میں بہت سی نفسیاتی دیواریں بھی تعمیر نہیں کی ہیں۔ ریاست پر یونین الیکشن کمیشن کے دائرہ اختیار کی توسیع کے بعد بھی ریاست اور خاص طور کشمیر وادی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں ہم نے اُسی پرانے انداز سے الیکشن کرائے ہیں۔اس کے نتیجے میں جمہوری اداروں پر اعتماد مکمل طور پر اُٹھ گیا ہے اور عام لوگوں کی اکثریت اس بات کی قائل ہوگئی کہ جمہوریت کے ساتھ ہندوستان کی وابستگی پُر خلوص اور سچی نہیں ہے۔ یہ بات کسی حد تک اُس ردعمل کا جواز مہیا کراتی ہے جو پچھلے سال کشمیری عوام نے بنگلہ دیش کے واقعات کے تعلق سے ظاہر کیا۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ پاکستانی فوجی حکمرانوں نے بنگلہ دیش میں جو مظالم روا رکھے، کشمیر کے لوگوں نے اس لئے اُن کو یا تو نظر انداز کر دیا یا اُن کی تاویلیں کیں۔ کیوں کہ ہندوستان نے وہاں مجاہدین آزادی کو اخلاقی اور مادی امداد بہم کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ بنگلہ دیش اور کشمیر کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ان دو کی صورت حال کیفیاتی طور پر مختلف ہے اور انہیں ایک ہی سطح پر ٹھہرانا بے حد غلط ہے۔لیکن یہ مرکزی سوال نہیں ہے، میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ گذشتہ چوبیس سال میں کشمیری عوام کو جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔واقعات اور کوائف کے متعلق ان کا ردعمل غیر معمولی بن گیا ہے۔وہ کمتری اور عتاب کے سخت احساس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ہم نے ایک پوری قومیت کو ذلیل اور مریض بنا دیا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ہم مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے ماضی کو دریافت کریں اور اُس پر بحث کریں۔ کشمیر میں گذشتہ چوبیس برسوں میں جو کچھ پیش آیا ہے۔اُس سے ملک کا روشن خیال طبقہ اچھی طرح سے واقف ہے۔اور یہ بات بڑی حسرت ناک ہے کہ مفاد خصوصی کا یہ طبقہ یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہو گیا ہے، کہ اگر کشمیر میں غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے گئے تو وہاں سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ یہ مرکزی حکومت اور ہندوستانی لوگوں کو بلیک میل کرنے کا ایک بڑا شاطر حربہ ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے، کہ یہ بلیک میل چل گیا ہے اور کشمیر میں مفادِ خصوصی موج منا رہا ہے۔ میرا خیال ہے، کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، اور ہمیں اس کی مزید اجازت نہیں دینی چاہئے۔ برصغیر کے حالیہ واقعات اور کشمیریوں کے بدلے ہوئے موڈ کی وجہ سے اس وقت کشمیر میں ایک موثر ابتداء کرنے کا اِنتہائی سازگار موقع ہاتھ آیا ہے۔ ہمیں کشمیر میں معمول کی جمہوری زندگی کو بحال کرنے کے لئے مسلمہ کشمیری رہنماؤں کے ساتھ گفتگو شروع کرنی چاہئے۔ ہمیں ریاست کے عوام اور باقی ملک میں رہنے والے عوام کے درمیان نفسیاتی دیواروں کو ڈھا دینے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے کشمیر میں پاکستانی موقف کے اخلاقی جواز کو ختم کر دیا تھا۔ اب ۱۴ دن کی جنگ نے اُسے ایک دعویدار طاقت کی حیثیت سے ختم کر دیا ہے۔ لیکن کشمیر کے عوام بہرحال ایک فریق بنے رہیں گے۔ اور ہم انہیں نظرانداز کر ہی نہیں سکتے۔ شیخ محمد عبداللہ سے لے کر خواجہ غلام محی الدین قرہ تک ہر قابلِ ذکر کشمیری لیڈر نے ہند کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو حتمی مان لیا ہے، اس طرح ہم نے پاکستان کے خلاف فوجی اور قانونی جنگ جیت لی ہے۔ لیکن ہمیں کشمیر میں اخلاقی جنگ بھی جیتنی ہے۔ یہ جنگ اس طرح جیتی جا سکتی ہے، کہ ہم وہاں ایک آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرا کے ایک ایسی حکومت بنوائیں، جو مسز اندرا گاندھی کے سامنے نہیں بلکہ ریاستی عوام کے سامنے جوابدہ ہو۔ اب کشمیری عوام کے بغیر کوئی مسلہ کشمیر باقی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نہیں اور ہمیں اُنہیں مطمین کرنا ہوگا۔ وقت آ گیا ہے، کہ ہم موجودہ اسمبلی کو توڑ ڈالیں اور وہاں پر آزادانہ انتخابات کرائیں۔ نئ اسمبلی، نئ صورت حال کا جائزہ لے گی اور ملک کے بہترین مفادات میں کام کرے گی۔ مجھے امید ہے کہ مفاد خصوصی اس باہمت پہل کا راستہ نہیں روکے گا۔

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

یہ نفسا نفسی کا عالم

ہم تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں، وہاں اُمور خانہ داری کی طرح امور مملکت بھی ایک سائینسی ضابطہ بن چکے ہیں۔ ایک وقت تھا جب سمجھا جاتا تھا کہ کسی ملک کا بادشاہ سخی ہو، رحمدل ہو، خداترس ہو، تو رعایا چین سے دِن کاٹے گی۔ اب بھی اِن انفرادی خوبیوں کی ضرورت کم نہیں ہوئی، لیکن اِنہیں جمہوریت اور انتظامیہ کے جدید تصورات کی تہذیب اختیار کر کے خاص پیرایے میں صورت پذیر ہو جانا پڑتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے موجودہ حکمران نہ تاریخ اور نہ ہی سیاسی سائنس کی کسی ابجد سے واقف ہیں، کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا ہے کہ کشمیر سولہویں صدی کے جاگیرداری نظام میں پھر واپس پہونچ گیا ہے، جہاں چند بڑے بڑے منصب داروں نے ریاست کو اپنے درمیان بانٹ لیا ہے اور وہ سستی خوشنودی کی ادائیں دِکھا کر بڑے بڑے اصولوں کا ناش کر رہے ہیں۔ ہمارے وزیروں نے اپنے خاص مصاحبوں اور خاص طور اُن لوگوں کو جنہوں نے انہیں ووٹ چوری سے کامیاب بنانے میں مدد کی ہے میں رعائتیں اور عنایات بانٹنے میں مشغول ہیں، لیکن ریاست کے مجموعی مُفاد کی لاش

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سیکریٹریٹ کے سرد خانے میں بے گور وکفن ڈول رہی ہے، جموں صوبے کو مہاشے تریلوچن اور لالہ گردھاری لال کے نام پٹہ کر دیا گیا ہے اور کسی کشمیری وزیر کو وہاں کے معاملات میں نہ دخل دینے کی جرأت ہے اور نہ اِس کی پرواہ، کشمیر میں تو ضلع دار، بلکہ تحصیل دار سطح پر علاقوں کی بندر بانٹ کی گئی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اِن منصب داروں کے درمیان اعلیٰ ترین سطح پر یہ خاموش تفہیم پیدا ہو گئی ہے کہ ایک دوسرے کی سرحدوں کی خلاف ورزی نہیں کی جائیگی، اب تو حالت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ جماعتِ اسلامی، جن سنگھ اور دوسری ایسی ہی ناسور زدہ سیاسی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کے بعد کانگریس کے جگادری اسمبلی کے ایوان میں شہری اور دیہاتی کا جھگڑا کھڑا کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن ذہنی فالج زدوں اور سیاسی نابالغوں نے کشمیر کو دورِ جاہلیت میں واپس پہونچانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ بے دردی اور بے استعدادی کا عالم یہ ہے کہ سرکاری خزانے کو ایک ایسی لاش سمجھا جا رہا ہے جس پر ہر کُتے اور ہر گِدھ کا حق ہے اور جتنے بھی اُس کے دانت تیز ہوں، اُس کے پنجے لمبے ہوں، وہ اُتنی ہی بوٹیاں نوچ سکتا ہے۔ بھوکے گِدھوں اور کُتوں نے ایک عجیب سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ جتنا پیٹ بھر سکو بھر لو اور اِس کی پرواہ مت کرو کہ اور کون کون اِس لوٹ میں شریک ہونے کے لئے آتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سماج کی عمیق ترین صفوں میں جتنے بھی آدم خور گِدھ چھپے ہوئے تھے، وہ آگے آنے لگے ہیں اور کانگریس کے دروازوں کو کھُلے پا کر بلا روک ٹوک اِس چھیر پھاڑ میں اپنا حصّہ حاصل کرنے لگے ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے نام پر یا اِس کے بغیر جتنے بھی عوام کے مُسترد کئے ہوئے لوگ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے، آج انہیں کانگریس کی صفوں میں اپنی تھوتھینا نِکالے دیکھا جاسکتا ہے۔ چونکہ ریاست میں کانگریس کی تعمیر میں ہی خون خواری، عوام آزاری اور مُردم بیزاری کی صورت مُضمر ہے۔ لہٰذا اِس کے باسی اِن نئے جنگلیوں کی آمد کو اپنی برادری کی دست پذیری سے تعبیر کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے کو تحفظ اور سلامتی کا احساس بخش رہے ہیں۔

ریاست کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو اِس صورت حال کا کچھ عمیق نظر سے جائزہ لینا چاہئے۔ اچھی قیادت کی نشانی صرف اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی دلنوازی اور اُن پر مُسکراہٹ کی بارش کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ کئی موقعوں پر سختی اور تنبیہ کے ناخوشگوار فرائض انجام دینا بھی ہوتا ہے۔ قوم کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لئے صرف ہر شورہ پُشت اور خود سر شخص کی جا و بے جا غلط کاریوں کے آگے جھک جانا ہی مددگار نہیں ہوتا، بلکہ قوم کے محافظ کی حیثیت سے کبھی کبھی اُنہیں آنکھیں دکھانا بھی ضروری بن جاتا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے ساتھیوں کی خدمات کا صلہ چُکانے اور اُن کی دھونس کی لاج رکھنے میں مصروف ہیں۔ اگر اُنہیں ایک جمہوری حکمران کی حیثیت سے اپنا فرض نبھانا ہے تو اِس کے لئے انہیں موجودہ بندر بانٹ، بے راہ روی اور بے اعتدالی کے سیلاب پر بند باندھنے کے لئے کمر بستہ ہونا پڑے گا۔ انہیں اپنی شخصیت میں تھوڑا سا فولاد پیدا کرنا ہوگا جس کے بغیر وہ اپنے ساتھیوں کے خونخوار جبڑوں کو آداب نہ سکھا سکیں گے۔

......☆......

(۳۱؍ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسز گاندھی اور عدلیہ

مسز اندرا گاندھی کی حالیہ تقریروں، ان کے مزاج کی کیفیت اور سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس کی تقرری میں ان کی روایت شکنی سے یہ اندزہ ہوتا ہے، کہ پارلیمانی نظامِ حکومت سے رفتہ رفتہ ان کا اعتقاد اُٹھتا جارہا ہے اور وہ ملک کو ایک کنٹرولڈ قسم کی جمہوریت کی طرف لے جانے کا عزم کر چکی ہیں۔ 'کنٹرولڈ جمہوریت' اور آمریت میں چونکہ صرف اُنیس بیس ہی کا فرق ہے، اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ملک میں جمہوری نظام کے خاتمے کی ابتداء ہو چکی ہے، اور اب صرف دیکھنا ہے کہ اس کی جگہ کس قسم کی آمریت جنم لے گی، ابھی چند ہفتے قبل جب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے نئی دہلی کے اجمل خان پارک میں کانگریسی 'جمعداروں' کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ مخالف پارٹیوں کو تحریر و تقریر کی کتنی آزادی دی جاسکتی ہے۔'' تو پارلیمنٹ میں مخالف پارٹیوں نے اِس پر بڑا ہنگامہ کیا اور وزیر اعظم نے اس آمرانہ بیان کی تردید کرنے کی بجائے اس کی وضاحت کی۔ مخالف پارٹیوں کے خلاف وہ کچھ عرصے سے جس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات دے رہی ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کہ وہ اختلاف Dissent کی ہر آواز سے خائف ہیں اور ان کا بس چلے، تو وہ پورے ملک پر قبرستان کی سی خاموشی طاری کر دیں۔ سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس کی تقرری اِس سمت میں ایک نہایت فیصلہ کُن قدم ہے!۔

مجھے اِس بات سے انکار نہیں کہ حکومت کو سپریم کورٹ کے جج اور چیف جسٹس نامزد کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ آئین کی دفعہ 124 اور 126 کی رُو سے صدر جمہوریہ وزیر اعظم کی سفارش پر سپریم کورٹ کے کسی جج کو چیف جسٹس مقرر کر سکتا ہے، لیکن نئے چیف جسٹس مسٹر، اے۔ این۔ رے کی تقرری جس پس منظر میں ہوئی ہے، اس نے اس تقرر کو ہی نہیں، ملک میں ایک آزاد عدلیہ کے تصور کو بھی مشکوک بنا دیا ہے، اِس سے پہلے سپریم کورٹ کے سب سے سینئر جج کو چیف جسٹس بنانے کی رسم اور روایت کا پالن ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ یہ معیار ہر اعتبار سے تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا، بحیثیت مجموعی اس کی اہمیت، افادیت اور ضرورت مسلم تھی۔ اِس اصول اور روایت نے چیف جسٹس کی تقرری کو ذاتی پسند اور ناپسند اور سیاسی آمیزش اور آویزش کی سطح سے بلند کر دیا تھا، اور بہت حد تک سپریم کورٹ کی آزادی اور خود مختاری کو تقویت ملی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مسز اندرا گاندھی کے ''نئے منصوبے'' میں ملک کی سب سے بڑی عدالت کی آزادی کو بے راہ روی سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ اور اِس بے راہ روی پر قابو پانے کے لئے سب سے سینئر جج کی بجائے سب سے پسندیدہ جج کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ میں مسز گاندھی کے وزیرِ فولاد مسٹر موہن کمار منگھلم نے تو برملا طور پر اِس بات کا اعتراف کیا ہے، کہ نئے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

چیف جسٹس کو ٹھوک بجا کر منتخب کیا گیا ہے اور اس میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں، کہ جو حکومت کو مرغوب اور محبوب ہیں۔ حکومت نے اپنی روایت شکنی کے جواز میں لاء کمیشن کی وہ رپورٹ پیش کی ہے، کہ جس میں سولہ برس پہلے یہ سفارش کی گئی تھی کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے لئے صرف سینیارٹی ہی نہیں، قابلیت، رہنمایانہ اوصاف اور انتظامی تجربے کا ہونا بھی ضروری قرار دیا جائے۔ قطع نظر اِس بات کے کہ لاء کمیشن کی اِس سفارش کو نہایت مشکوک اور پُر اسرار حالات میں تسلیم کیا گیا ہے، پوچھا جا سکتا ہے، کہ سپریم کورٹ کے ججوں کی قابلیت، اہلیت اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ کون کرے گا، اور اِس بات کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا۔ کہ ایک جج دوسرے سے بہتر اور دوسرا تیسرے کے مقابلے میں کم تر ہے۔ اگر اِس بات کا فیصلہ سرکار پر چھوڑ دیا جائے، تو اِس بات کا اندیشہ ہے کہ سرکار اِسی جج کو ترجیح دے، کہ جو سرکاری نکتہ نظر اور سرکاری مفادات کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہو۔ اِن حالات میں آزاد اور خود مختار عدلیہ کا تصور کیونکہ قائم رہ سکتا ہے۔ اور خاص طور پر یہ بات ذہن نشین کی جانی چاہیئے، کہ سپریم کورٹ میں ساٹھ فیصد مقدمات میں حکومت فریق ہوتی ہے، گویا ایک فریق کو اپنی پسند کا جج نامزد کرنے کا اختیار حاصل ہے اور دوسرے فریق کو اِس پر چون و چرا کرنے کی بھی آزادی نہیں۔ یہی وہ اندیشے ہیں، کہ جن کی بناء پر ملک بھر میں بے چینی، بے اطمینانی اور غم و غصے کی لہر دوڑ گئی ہے۔

مجھے اِس بات کا اعتراف ہے، کہ محض سینیارٹی تقرر اور ترقی کی بنیاد نہیں بن سکتی اور خاص طور پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس میں یقیناً اِس کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

علاوہ بھی کچھ مثبت خصوصیات ہونی چاہئیں، لیکن ۲۵ برس کی روایت کو توڑنے سے پہلے یہ ضروری تھا، کہ حکومت اپنے ارادے سے پارلیمنٹ اور جوڈیشری دونوں کو قبل از وقت آگاہ کرے، تاکہ اِس سلسلے میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ لیکن عین وقت پر جس خفیہ اور پُراسرار طریقے پر نئے چیف جسٹس کی نامزدگی کا اعلان ہوا، اس نے اِس منصب کے وقار کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے۔ غضب یہ ہے کہ ریٹائر ہونے والے چیف جسٹس مسٹر سیکری نے بھی یہ خبر پہلی بار ریڈیو پر ہی سُنی۔ حالانکہ نئے چیف جسٹس کے انتخاب اور نامزدگی میں ان کے صلاح و مشورے کو اولین اہمیت حاصل ہونا چاہئیے تھی، فلسطینی مجاہد Commanoos کی طرح حکومت کا حملہ اِس درجہ غیر متوقع اور یک لخت Sudden تھا، کہ اِسے شب خون کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

عدلیہ پر مسز اندرا گاندھی کے اس مہلک حملے کے جواز میں ان کے وکیل مسٹر موہن کمار منگھلم نے پارلیمنٹ میں جو دلیلیں دیں، اِن سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے، کہ مسز گاندھی اور ان کے بعض ساتھیوں کے لئے پارلیمانی جمہوریت میں کوئی دلچسپی یا دلکشی باقی نہیں رہی ہے۔ مسٹر موہن کمار منگھلم نے سپریم کورٹ کے ججوں کو قدامت پسند، فرسودہ ذہن اور رجعت پسند قرار دیتے ہوئے برملا طور پر اِس بات کا اعلان کیا کہ آئندہ ججوں کے انتخاب میں ان کے سیاسی نظریات، سماجی فلسفے اور حکومت کے تئیں ان کے رویے کو مدِ نظر رکھا جائے گا۔ سپریم کورٹ کے موجودہ جج، جن میں تین مستعفی شدہ جج بھی شامل ہیں، کب اور کس نے مقرر کئے تھے؟ یہ ایک اہم سوال ہے، گزشتہ پچیس سال

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے اِس ملک پر مسز گاندھی اور ان کے والدِ محترم کی حکومت رہی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ سبھی جج باپ بیٹی کے حسنِ انتخاب کی یادگار ہیں۔ ان پر قدامت پسندی، تنگ نظری، رجعت پسندی اور اِس نوعیت کے درجنوں الزامات عائد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ مسز اندرا گاندھی سوچ سمجھ کر اپنے باپ جواہر لال نہرو کے نظریات اور ان کے انتخابات کو غلط، ناجائز اور نامعقول سمجھتی ہیں۔ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہی سپریم کورٹ کے جج، جو کل تک قابلیت، اہلیت اور دیانت کی تابندہ مثالیں تھیں۔ آج قدامت اور تاریکی کی علامتیں کیونکر بن گئے؟ یہ پہلا موقع نہیں کہ مسز گاندھی نے اپنی بڑائی اور عظمت جِتانے کے لئے اپنے باپ کا مذاق اُڑایا ہے وہ جب سے اِس ملک کی وزیرِ اعظم ہوئی ہیں، اپنے باپ کے تئیں ان کا یہی رویہ رہا ہے، وہ اکثر کہتی ہیں کہ پچھلے پچیس برسوں میں کچھ نہیں ہوا ہے، اور جو کچھ ہو رہا ہے، اب ان کی بدولت ہو رہا ہے۔ بہر حال! یہ محض ایک جملہ معترضہ تھا، اصل بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ کو طنز اور استہزا کا موضوع بنانے والوں کی نیت میں فتور آ گیا ہے، اور وہ اپنی من مانیوں پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے والے اداروں کا خاتمہ کرنے پر تُل گئے ہیں۔ سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس کے تقرر کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ سپریم کورٹ حکومت کی ترقی پسندانہ پالیسیوں کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی ہے۔ اور اِس دیوار کو گرائے بغیر مسز گاندھی کی انقلابی حکومت کے لئے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ پچھلے کئی سال کے دوران سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں سے واقعی حکومت کی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، لیکن کیا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے سپریم کورٹ کو ختم کرنے کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں؟ عدالتِ عالیہ نے بنیادی حقوق کے متعلق اپنے تازہ ترین فیصلے میں پارلیمنٹ کی سرداری، برتری اور خود مختاری کو تسلیم کیا ہے اور کیا یہ مناسب اور موزون نہیں کہ ہم سماجی انقلاب لانے کے لئے سپریم کورٹ کی بجائے پارلیمانی اداروں سے کام لیں؟ پارلیمنٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آئین میں جو بھی ترمیم کرنا چاہے، کر سکتی ہے۔ اور سرپیم کورٹ کا کوئی بھی فیصلہ آئین میں مناسب طریقے سے ترمیم کرنے سے بدلا جا سکتا ہے۔ ایسا ہوا ہے اور ایسا ہونے کا امکان باقی ہے، پھر سپریم کورٹ کو اپنی تمام ناکامی اور نامرادی کا ذمہ دار قرار دینا کہاں کا انصاف ہے۔ بات یہ ہے کہ مسز گاندھی اپنی تمام ناکامیوں اور کوتاہیوں کے لئے کسی نہ کسی بہانے Scapegoat کی متلاشی رہتی ہیں۔ کچھ عرصے سے وہ اپوزیشن کو موردِ الزام گردان رہی ہیں کہ انہی کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں، ورنہ وہ ملک سے غریبی کا خاتمہ کر چکی ہوتیں، پھر وہ ملک کے اخبارات پر برس پڑیں، کہ ان کی وجہ سے لوگوں کو حقیقت کا علم نہیں ہوتا اور یہ کہ یہ اخبار والے اُن کی مخالفت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اب ان پر سپریم کورٹ کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ کہہ رہی ہیں کہ سپریم کورٹ ان کے غریبی ہٹاؤ پروگرام میں حائل ہو رہی ہے۔ اور اس لئے وہ اِس عدالت کا کردار اور مزاج بدلنا چاہتی ہیں۔ نئے چیف جسٹس کا انتخاب اسی ''آپریشن'' کا ایک حصہ ہے۔ سپریم کورٹ اگر واقعی مسز اندرا گاندھی کے ترقی پسند منصوبوں میں حائل ہے، تو پھر آئین میں ترمیم کر کے اس ادارے کو ختم کرنے کے لئے اقدامات کیوں نہیں کئے جاتے؟

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسز گاندھی کے پاس اتنی اکثریت ہے کہ وہ آئین میں جو ترمیم کرنا چاہیں کر سکتی ہیں۔ پھر وہ ہندوستان کے آئین میں یہ ترمیم کیوں نہیں کرتیں، کہ آئیندہ سے کانگریس کا صدر بیکوقت سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بھی ہوا کرے گا۔ اس سے ججوں کے سیاسی نظریات اور ان کے سماجی فلسفے کی چھان بین میں غیر ضروری وقت ضائع ہونے سے بچ جائیگا۔ اور مسز گاندھی کو بلا روک ٹوک اپنا غریبی ہٹاؤ پروگرام چلانے کا موقع مِل جائے گا۔ دراصل یہ سب بہانہ بازیاں ہیں اور مسز اندرا گاندھی اپنے اقتدار کو دائمی بنانے کے لئے وہ تمام رکاوٹیں دور کر رہی ہیں کہ جن سے ان کے اقتدارِ مطلق کو کسی قسم کا خطرہ درپیش ہو۔ خود مختار سپریم کورٹ ایک اسی قسم کا خطرہ تھا، جسے دور کیا گیا ہے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی تقرری میں سینیارٹی کے اصول کو نظر انداز کر کے مسز گاندھی نے فوری طور اپنی خیریت اور عافیت کا اہتمام تو کر لیا، لیکن مستقبل میں اس سے جو شدید اُلجھنیں اور مشکلات پیدا ہوں گی، اس کا خمیازہ پورے ملک کو اٹھانا پڑے گا۔ مستقبل قریب میں جب سپریم کورٹ میں سب کے سب جج ترقی پسند اور باشعور ہوں گے تو پھر ان ترقی پسندوں اور باشعوروں میں سب سے زیادہ ترقی پسند اور باشعور جج کا انتخاب کس بنیاد پر ہوگا؟ یقیناً اُس وقت انتخاب کا معیار یہ ہوگا، کہ کونسا جج کس کا منظور نظر ہے اور جب سپریم کورٹ کا چیف جسٹس حکومت کا منظور نظر اور حکمرانوں کا دوست ہو، تو پھر اس ملک میں عدلِ نوشیروان کی یاد تازہ کیوں نہ ہو جائے؟

(۷ر مئی ۱۹۷۳ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

قیامت صغریٰ

لے دے کے اب شہر میں ایک ہی چیز مہیا تھی، اور وہ تھا پڑول، دو چار دن سے یہ بھی غائب ہے۔ اور میرا تجربہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی کوئی چیز کمیاب ہونے لگتی ہے تو پھر وہ رفتہ رفتہ نایاب ہی ہو جاتی ہے۔ مٹی کا تیل ہو یا کہ کوکنگ گیس، بناسپتی گھی ہو یا جلانے کی لکڑی شہر میں ہر چیز کا کال پڑا ہوا ہے۔ اور اب پٹرول کا قحط ایک نئی مصیبت ہے۔ جس کے فوری طور پر ٹلنے کا کوئی امکان نہیں آتا۔ بظاہر پٹرول ایک ایسی شے ہے کہ جس کی ضرورت صرف موٹر اور سکوٹر والوں تک ہی محدود ہے۔ لیکن غائرِ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی نایابی کا اثر زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر پڑے گا اور خاص طور اس غریب اور نادار طبقے پر، کہ جس کی کمر زندگی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے دوہری ہوگئی ہے۔ ابھی حال ہی میں جب مرکزی حکومت نے پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کیا تو ناگزیر طور پر ضروریاتِ زندگی کی دوسری اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا، پٹرول انسانوں کی نقل وحرکت کے لئے ہی نہیں، اجناس خوردنی اور روزمرہ کی ضروریات کی ہر چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے بہت ضروری

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔ اس لئے جب اس کی قیمت میں اضافہ ہوگا، تو یقیناً ان تمام چیزوں کی قیمت بھی متاثر ہوگی۔

وادی کشمیر میں یوں بھی ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں ملک کے مختلف حصوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن پچھلے ایک سال سے اس ریاست میں جو قیامتِ صغریٰ بپا ہے اس نے گراں بازاری کے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہاں کی ساری معیشت کا انحصار آسمان اور بانہال پر ہے۔ آسمان پر بادل چھانے کی دیر ہے کہ بانہال کی ناقابلِ اعتبار شاہ راہ یا تو بند ہو جاتی ہے یا اس کے بند ہو جانے کی افواہ اڑائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ضروریات زندگی کی ہر شے یا تو غائب ہو جاتی ہے یا منہ مانگے داموں بیچی جاتی ہے۔ عیاسی اور آرائش کا سامان تو چھوڑ دیجئے کہ اس کے بغیر بھی زندگی گزر ہی جاتی ہے۔ لیکن شیونگ لیڈ سے لے کر سیونگ مشین تک کون سی ایسی چیز ہے کہ جس کے دام یہاں ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ نہیں ہیں۔ ایک سستے چاول کے سوا اور کون سی شے ہے کہ جو معقول اور مناسب قیمت پر یہاں مہیا ہے۔ اور ان سستے چاولوں کے لئے بھی ہم ہر سال ۱۱ کروڑ روپیہ کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ یعنی افرادی طور ہم سستے چاول کھاتے ہیں لیکن سرکاری خزانے سے اس عیاشی پر گیارہ کروڑ روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں یہ غیر معمولی اضافہ اس لئے ناقابلِ برداشت بنتا جا رہا ہے کہ ان میں کوئی ٹھہراؤ نظر نہیں آتا۔ اور تقریباً ہر روز ان میں اضافے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ ابھی صرف چند ہفتے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

قبل سرکاری طور پر بناسپتی گھی اور پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا اعلان کیا گیا۔ حالانکہ صرف تین ماہ قبل انہی چیزوں کی قیمتوں میں ایک اضافہ ہو چکا تھا، کالے دھن اور اوپر کی آمدنی والے سرکاری اور کاروباری پونجی پتیوں کے لئے قیمتوں کی یہ 'پرواز' کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن مقررہ آمدنی والے اوسط طبقے کے لئے ایک نئے پیسے کا اضافہ بھی قیامت سے کم نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سارے ملک میں اضطراف اور اضطرار کی کیفیت بڑھتی جارہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک ایک خطرناک انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔ پانچواں پنجسالہ منصوبہ، وزیر منصوبہ بندی شہری درگا پرشاد در کی خوبصورت انگریزی اور زوردار وکالت کے باوجود موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ پلان کے ڈھانچے کو بچانے کی کوشش میں ملک کا سیاسی ڈھانچہ ہی دَم توڑ دے۔

جہاں تک ہماری ریاست کا تعلق ہے، بعض اشیاء کی کمیابی کو ملک کے موجودہ معاشی اور اقتصادی نحران کے پس نظر میں سمجھایا جاسکتا ہے۔ لیکن روزمرہ کی ضرورت کی بعض چیزیں ایسی ہیں کہ انہیں ہر حالت میں مہیا کیا جانا چاہیئے اور اگر کوئی حکومت ان کی بہم رسانی میں ناکام رہے تو اسے مسندِ اقتدار پر براجمان رہنے کا کوئی اخلاقی حق حاصل نہیں۔ بالن کی نایابی کے بعد بہت سے لوگ کوکنگ گیس استعمال کرنے لگ گئے۔ اور خود حکومت نے اس کے استعمال کے لئے ان کی حوصلہافزائی کی لیکن اب پچھلے آٹھ ماہ سے اس گیس کی سپلائی میں جو دھاندلی ہو رہی ہے اس نے گھریلو زندگی کا سارا نظام درہم برہم کر دیا ہے۔ چھ چھ ماہ سے لوگ گیس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی باری نہیں آئی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔ کیونکہ گیس کا زیادہ تر حصہ وزیروں، امیروں، سیاسی لیڈروں، ممبرانِ پارلیمنٹ اور کالے دھن کے تاجروں کے پاس جاتا ہے اور اس کے بعد جو بچ جاتا ہے وہ اوبرائے پیلس نیڈوز اور اسی درجے کے دوسرے ہوٹلوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ سلنڈر بچ جائیں تو وہ تقسیم کاروں کے عزیز داروں میں بٹ جاتے ہیں اور عام آدمی دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اب رہا مٹی کا تیل، یہ وہ شے ہے کہ جس کی حسرت لئے بہت سے لوگ اپنے آخری سفر پر بھی روانہ ہوگئے۔ سرکاری اعلانات کے مطابق جگہ جگہ مٹی کا تیل بہم ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مٹی کے تیل کی ایک بوتل حاصل کرنے کے لئے کئی کئی دن ضائع ہو جاتے ہیں۔ شہر میں سکاچ وہسکی کی بوتل تو آسانی سے مل سکتی ہے لیکن مٹی کے تیل کی بوتل ملنا ممکن نہیں۔ نہ بجلی ہے نہ لکڑی، نہ گیس ہے اور نہ مٹی کا تیل، اس حالت میں شہر کے لوگ اپنا دل جلا کر کھانا پکائیں گے یا وزیروں کے گھر جلا کر؟ کہ اس شہر میں نہ وہسکی کا قحط ہے نہ چرس کا اور نہ ٹیئر گیس کا، اور اگر کوئی چیز نایاب ہے، تو وہ ہے مٹی کا تیل اور کوکنگ گیس اور اب پٹرول۔ حیرت ہے کہ اس ریاست کا نظام چل کیسے رہا ہے۔ اور کون سی طاقت ہے جو اس اوپری ڈھانچے کو قائم رکھے ہوئے ہے؟ ایسے ہی مواقع پر خدا کے وجود اور اسکی قدرت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ وزیرِ اعلیٰ سے لے کر وزیرِ ادنیٰ تک کسی وزیر یا وزیر کی بیوی کو راشن، مٹی کے تیل، کوکنگ گیس یا لکڑی کے لئے خود بازار نہیں جانا پڑتا۔ اور نہ کبھی ان شاہزادوں اور شاہزادیوں کو کیو میں کھڑا ہونے کا تجربہ ہوا ہے۔ اس لئے انہیں اس بات کا احساس اور اندازہ ہی نہیں، کہ عام

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

لوگوں پر کیا گزرتی ہے۔ اب پٹرول کا قحط ہے تو ان کی بلا سے، سرکاری گاڑیوں میں اس سے پہلے بھی سرکاری پیٹرول پڑتا تھا، اب بھی پڑے گا۔ گیس والے سب سے پہلے ان کے گھر گیس بیجدیں گے، مٹی کے تیل کا ڈیلر ہر ماہ کے شروع میں ایک نہیں کئی کنستر دے جاتا ہے۔ ان حالات میں اربابِ حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عوام کے دکھ درد کو محسوس کر کے ان کی مشکلات حل کرنے کے لئے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کریں گے، عبث ہے۔ شہری عوام کو شہری سطح پر منتظم ہو کر اس طوفان کا مقابلہ کرنا پڑے گا کہ جو سماج کے اوسط اور پچھلے طبقے کو زندہ درگور کرنے پر تلا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنے کے لئے رائے عامہ کو بیدار اور منظم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ تاکہ بدکردار اور بد اطوار تاجروں کو من مانی کرنے سے روکا جاسکے، ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کی سازش کو بے نقاب کرنے میں حکومت تعاون کرے تو بہتر، ورنہ عوام کو قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر ایسے عناصر سے نپٹنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔ جو باتوں سے نہیں مانتے، کوکنگ گیس اور مٹی کے تیل کا قحط مصنوعی ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری ''جاگیرداروں'' نے پیدا کیا ہے۔ اگر حکومت یہ قلت اور دقت دور کرنے میں ناکام رہے تو اسے اس کے نتائج بھگتنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ عوام کے ساتھ ایک مدّت سے ناانصافی اور مذاق ہو رہا ہے۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ اور اب لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا ہے۔ کیا سید میر قاسم اور ان کی حکومت نوشتۂ دیوار پڑھنے کی کوشش کریں گے؟

(۳۰/جون ۱۹۷۲ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

تیسرا صفحہ

چراغ بیگ کے قلم سے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رقابت سے قُربت تک

پچھلے کئی ماہ سے دُنیا کے سیاسی موسم میں خوشگوار تبدیلی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مفاہمت، مصالحت، دوستی اور تعاون کی مرحوم قدریں ایک بار پھر زندہ ہورہی ہیں، جنگ وجدل، نفرت و بیزاری دشمن اور بے اعتمادی کی ستائی ہوئی دُنیا اپنی دیوانگی اور حماقتوں سے سبق سیکھ کر ایک نئے باب کا آغاز کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے اور ساری دُنیا پر دوستی کا موڈ طاری ہے، اِس نئے موڈ کا آغاز امریکی صدر نِکسن کے دورۂ چین سے ہوا، جب ایک دوسرے کے جانی دشمنوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا کر یہ ثابت کر دیا کہ سیاست میں دوستی کی طرح دشمنی کی قدریں بھی اضافی ہوتی ہیں، پھر مسٹر نکسِن ماسکو بھی گئے، اور اسطرح دُنیا کی تینَ بڑی طاقتوں کے درمیان برسوں بعد مکالمے اور مراسلت کی نوبت آگئی، روس اور چین کی آپسی بول چال اگر چہ ابھی بند ہے، لیکن واقف کار حلقوں کا کہنا ہے، کہ مسٹر نِکسن دونوں کے درمیان پوسٹ مین کا فریضہ انجام دینے کیلئے بالکل آمادہ ہیں۔ اور چراغ بیگ کو تعجب نہ ہوگا، کہ اگر ایک دن یہ خبر بھی آجائے، کہ چینی رہنما ماؤزی تنگ اپنی موت سے پہلے روسی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رہنما برزنیوف سے ملنے کے لئے ماسکو پہنچ جائیں۔ امریکہ اور چین کی باہمی عداوت اور دشمنی کی برف پگھلتے ہی چین اور جاپان جیسے ازلی دُشمنوں نے بھی دوستی، اشتراک اور عاشقی معشوقی کی باتیں شروع کردیں۔ اور پھر یہ معجزہ بھی دیکھنے میں آیا، کہ جاپانی وزیراعظم بیجنگ جاکر، چینیوں سے اپنے پُرانے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہیں، اسی طرح مشرقی اور مغربی جرمنی، شمالی اور جنوبی کوریا کے محاذوں سے بھی اتحاد واتفاق اور اشتراک کی غیر متوقع اور حیران کُن خبریں موصول ہونے لگیں، اور تعجب نہیں، کہ مستقبل قریب میں جرمنی اور کوریا مشرقی اور مغربی، شمالی اور جنوبی کی بجائے صرف جرمنی اور کوریا ہی کہلائیں، یہ تو رہیں دُور کی باتیں۔ برصغیر میں بھی سترہ دن کی تباہ کُن جنگ کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کے کچھ امکانات روشن ہوتے نظر آنے لگے، اور شملہ میں پاکستانی صدر اور ہندوستانی وزیراعظم کی باہمی ملاقاتوں نے بجاطور پر یہ اُمید پیدا کردی، کہ ۲۵ رسال کی دشمنی اور بے اعتمادی..... دوستی اور باہمی اعتماد میں بدل جائے گی۔ شملہ سمجھوتے پر عمل کرنے کے سلسلے میں اگر چہ کچھ دُشواریاں حائل ہوگئی ہیں لیکن چراغ بیگ کو اس بات کا سو فیصدی یقین ہے، بآلاخر یہ دشواریاں دُور ہوجائیں گی۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت اور تعاون کی ایک نئی فضا قایئم ہو کر رہے گی، میرا یہ اعتماد میری خوش فہمی کی بجائے ٹھوس حقائق اور تمام دنیا میں بدلی ہوئی سیاسی صورت حال کے تجربے پر قائم ہے۔ اگر امریکہ اور چین -- چین اور جاپان مشرقی اور مغربی جرمنی۔ شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان مصالحت اور مفاہمت ہوسکتی ہے تو ہندوستان اور پاکستان

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کی دوستی کچھ بعید نہیں ہے، تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ویتنام کی جنگ بھی اب آخری مرحلے میں ہے، اور شمالی اور جنوبی ویتنام کے عوام بھی عنقریب ہی جنگ کی ہولناکی اور تباہ کاریوں سے نجات پا کر امن اور چین کی زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اِس پس منظر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا، کہ بیسویں صدی کی آخری چوتھائی امن دوستی، اشتراک، اعتماد، مفاہمت اور بھائی چارے کی چوتھائی ہوگی۔ اور ایک مدت کے بعد جنگ اور نفرت کی ماری ہوئی دُنیا چین کا سانس لے سکے گی، ویتنام، چین، جاپان، جرمنی، کوریا، روس اور امریکہ کی باتیں تو بہت دُور کی باتیں ہیں اپنے ہاں کشمیر میں بھی ایک نئی صبح طلوع ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کی دشمنی، رقابت، نفرت اور عداوت، دوستی میں تبدیل ہو رہی ہے اس عمل کا آغاز یوں تو ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا، لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے پیش نظر اسے صبح نہیں، صبح کاذب ہی کہا جا سکتا ہے۔ نئی صبح کا طلوع دراصل اس وقت ہوا تھا، کہ جب اِس سال جون میں ڈیڑھ سال کی جلاوطنی کے بعد شیخ صاحب کو کشمیر جانے کی اجازت دی گئی، اور وزیراعظم مسز اِندرا گاندھی نے اِن سے ملاقات کر کے ایک نیا باب شروع کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، وزیراعظم اور شیخ صاحب کے درمیان یہ ملاقات اس لحاظ سے اہم تھی، کہ دونوں لیڈر ایک دوسرے کا احترام کرنے کے علاوہ ایک دوسرے کی مشکلات اور نکتہ نظر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اِس لئے جائز طور پر یہ اُمید بندھ گئی تھی، کہ اِس ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور کشمیر کی سیاسی اُلجھن کا کوئی با مقصد اور باعزت حل نکل آئے گا۔ لیکن بدقسمتی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے اِس کے بعد مسز گاندھی اور شیخ صاحب کے درمیان نہ صرف یہ کہ کوئی ملاقات نہ ہوسکی، بلکہ ایک دوسرے کی نسبت کچھ بدگمانیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ اِس مرحلے پر ریاست کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے بڑے تدبر اور دانش مندی کے ساتھ مسز گاندھی اور شیخ صاحب کے درمیان از سرِ نو رابطہ قائم کرنے میں مدد دی۔ عید کے روز شیخ صاحب کی قیام گاہ پر شیخ صاحب کو عید کی مبارکباد دینے سے ایک ہفتہ قبل قاسم صاحب نے ٹیلی فون پر شیخ صاحب کی خیر خیریت دریافت کر کے انہیں مسز گاندھی کی طرف سے یہ پیغام دیا تھا کہ وہ دہلی آکر اپنا طبی معائنہ کرائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اِس کے بعد قاسم صاحب جب عید کے دِن شیخ صاحب سے ملنے کے لئے گئے، تو دونوں لیڈروں کے درمیان نہایت خوشگوار ماحول میں گفتگو ہوئی چراغ بیگ، جو حسنِ اتفاق سے ہر اہم موقع پر موجود رہتا ہے، اِس ملاقات کے وقت بھی موجود تھا، اور اِس معمولی واقع کی غیر معمولی اہمیت پر غور کر رہا تھا، شیخ صاحب اور قاسم صاحب کے درمیان آدھے گھنٹے کی اِس ملاقات میں اگرچہ سارا وقت شہر میں بجلی کی کمی اور بجلی پیدا کرنے کے منصوبوں میں تاخیر پر ہی صرف ہوا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں، کہ اس ملاقات نے ۱۹/سال کی برف پگھلا دیا، اور شیخ صاحب پر اس کا نہایت خوشگوار ردِ عمل ہوا۔ سید میر قاسم کے جانے کے فوراً بعد ہی سابق وزیر اور پردیش کانگریس کے نائب صدر پیر غیاث الدین اور ان کے برادر اکبر پیر عبدالاحد بھی تشریف لائے، اور شیخ صاحب نے مسکرا کر اِن کا بھی خیر مقدم کیا۔ چند لمحے بعد ایک ایسے حضرت بھی تشریف لائے، کہ جنہوں نے شیخ صاحب کے خلاف مقدمہ سازش

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں ان کے خلاف بڑی زوردار شہادت دِی تھی، اُنہوں نے جب شیخ صاحب کو عید مبارک کہنے کے لئے ہاتھ بڑھایا، تو میری نگاہیں شیخ صاحب کے چہرے پر مرکوز ہوئیں اور میں اِن کا ردِعمل جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ شیخ صاحب نے مسکُراتے ہوئے، اُنہیں کچھ اِس انداز سے دیکھا، کہ جیسے کہہ رہے ہوں، سب یاد ہے، لیکن سب کچھ بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں--- قاسم صاحب نے پہل کر کے بہت سے مجرموں اور گواہانِ استغاثہ کا حوصلہ بھی بڑھا دیا ہے!

اب شیخ صاحب دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں داخل ہیں، تو یہاں بھی پُرانے ساتھیوں، نئے دوستوں، سیاسی حریفوں اور یتیموں کی ملاقات کا سلسلہ جاری ہے۔ چند دِن ہوئے پنڈت گردھاری لعل ڈوگرہ تشریف لائے تھے، ڈوگرہ صاحب سے شیخ صاحب کی یہ مختصر سی ملاقات ٹھیک بیس سال بعد ہوئی۔ اور شیخ صاحب کا خیال ہے کہ اِن بیس برسوں میں ڈوگرہ صاحب میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے (ہو بھی کیسے، جب سے اب تک برابر وزیر چلے آرہے ہیں۔ چراغ بیگ)

بیس سال قبل ڈی، پی صاحب نے اپنے آنے سے پہلے پھول بھیجے تھے۔ اور پھر لالہ تیرتھ رام کے ذریعہ اُن کی خبر و خیریت دریافت کی۔ ڈی پی شیخ صاحب کی کابینہ میں نائب وزیر تھے، آج وہ ہندوستان کی کابینہ میں سب سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ وزیر ہیں۔ بیس سال قبل ڈی پی صاحب نے شیخ صاحب کی برطرفی اور گرفتاری میں نمایاں رول ادا کیا تھا، بیس سال بعد انہیں اس بات کا احساس ہے، کہ اس برطرفی اور گرفتاری نے شیخ عبداللہ کو سیاسی طور پر ختم

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کرنے کی بجائے اِسے کشمیری عوام کا سب سے محبوب اور مقبول رہنما بنا دیا ہے، بیس سال قبل اور ان بیس سال کے دوران ڈی، پی شیخ عبداللہ کی شبیہہ کو مسخ کرتے رہے۔ اور آج بیس سال بعد وہ پھولوں کا تحفہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ یہ تاریخ کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے اور کتنی بڑی کروٹ! شیخ صاحب اور ڈی، پی کے درمیان نظریات کے فاصلے آج بھی کم نہیں ہوئے ہیں۔ دونوں میں علیک سلیک کا رشتہ استوار ہو رہا ہے یہ بڑی بات ہے۔ سید میر قاسم نے غیاث الدین ڈ وگرہ، ڈی، پی سب کو راستہ دِکھایا ہے!

اپنے ان پُرانے ساتھیوں سے مِل کر شیخ صاحب کیا سوچتے ہوں گے؟ انہیں کیا یاد آتا ہوگا؟ اور وہ کیا محسوس کرتے ہوں گے؟ یہ بڑے دلچسپ سوالات ہیں اور میں کسی دِن شیخ صاحب سے ان کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال میں ذاتی تعلقات کی اِس بحالی کو کشمیر کے مستقبل کے لئے ایک خوشگوار اور خوش آئیندہ علامت سمجھتا ہوں۔ آیئے، ہم سب دُعا کریں کہ پُرانے ساتھیوں کی یہ ملاقاتیں ریاستی عوام کیلئے با مقصد اور بابرکت ثابت ہوں۔ آمین!

.......☆.......

(۲۰ر مئی ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

تین ملاؤں میں مرغی حلال

حالیہ عام انتخابات کے دوران جب ریاست کے وزیرِاعلیٰ سید میر قاسم اور جماعتِ اسلامی کشمیر کا معاشقہ پروان چڑھ رہا تھا۔ تو نئی دلی میں ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے شمیم احمد شمیم نے ''کفر و اسلام'' کی اس خفیہ سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ اس وقت قاسم صاحب کے والنٹیروں اور قاری صاحب کے بٹیروں نے اِس نقاب کشائی کے لئے شمیم صاحب کو پانی پی پی کر کوسا تھا اور بزعمِ خود اِن کے الزام کی پُر زور تردید کی تھی لیکن انتخاب کے دوران اور اس کے فوراً بعد جماعتِ اِسلام کے پہلوانوں نے جس ڈھٹائی سے قاسم صاحب سے اظہارِ عشق کرنا شروع کیا اس سے جماعت کے متعلق حسن ظن رکھنے والے معصوموں کو بھی ''کفر و اسلام'' کے اِس گٹھ جوڑ کا اندازہ ہو گیا۔ جیل کی چار دیواری سے ہی جماعتِ اسلامی کے سید میر قاسم یعنی سیف الدین قاری نے حکومت کو اِنتخابات کے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہونے کا سرٹفکیٹ عطا فرمایا۔ اس کے بعد اسمبلی میں قاری صاحب نے قاسم صاحب سے مخاطب ہو کر بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ ''آپ نے ہمارے دِل جیت لئے ہیں'' پردیش کانگریس کے سیف

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

الدین قاری یعنی سیّد میر قاسم نے اس محبت اور شفقت کے عوض قاری صاحب کوئی کمیٹیوں کا ممبر نامزد کیا۔ میر قاسم کی دخترِ نیک کی شادی کے موقع پر قاری سیف الدین کے قاسم صاحب کی خدمت میں تحفہ درویش پیش کرنے کی حکایت آپ اس اخبار کی ایک گذشتہ اِشاعت میں پڑھ چکے ہیں۔اب اس معاشقے کی ایک تازہ ترین شہادت بھی مشتہر ہوگئی ہے۔ دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار ''انڈین ایکسپریس'' کی ۱۸ جون کی اِشاعت میں چوتھے صفحے پر جماعتِ اسلامی کے سید میر قاسم اور پردیش کانگریس کے سیف الدین قاری (معاف کیجئے کہ ترتیب کا خیال نہیں رہا) کی ایک تصویر چھپی ہے۔ یہ تصویر کیوں چھپی ہے۔اور کس نے چھپوائی ہے یہ دو اہم سوالات ہیں۔ وزیر اعلیٰ سے ہر روز ایک نہیں درجنوں ممبران اسمبلی ملتے ہیں۔لیکن قومی اخبار تو الگ کسی مقامی اخبار میں بھی آج تک اِن ملاقاتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا۔قاری صاحب کا قاسم صاحب سے ملنا کونسا ایسا تاریخی واقعہ تھا کہ اسے کیمرہ میں محفوظ کر کے لاکھوں لوگوں تک پہنچانا ضروری بن گیا؟ خاص قاری صاحب ہی پر یہ عنایت کیوں؟ یہ تصویر اگر قاسم صاحب نے چھپوائی ہے، تو یقیناً دُنیا کو یہ بتانے کے لئے کہ زمین پر صرف خدا کا قانون ماننے والے مردِ مومن، اب نہ صرف ہندوستانی آئین کو مانتے ہیں۔ بلکہ اِس آئین کو چلانے والے وزیروں اور نائب وزیروں کے ساتھ بیٹھ کر تصویر کھچوانے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر یہ تصویر خود قاری صاحب نے چھپوائی ہے۔تو اس کا مقصد جماعتِ اسلامی کے کارکنوں اور اپنے ووٹروں کو یہ یقین دلانا ہے کہ قاسم صاحب سے ان کی مفاہمت بے کار نہیں گئی اور اس کے عوض

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

انہیں وزیر اعلیٰ کے ساتھ تصویر کھچانے کی عزت حاصل ہوگئی ہے۔ اللہ! اللہ! کیا شان ہے جماعتِ اسلامی کے کردار سازوں کی۔ سیکولرازم کر زہر سمجھنے والے، اسمبلی میں چند نشستوں کی خاطر، اب اسے تریاق سمجھ کر پی رہے ہیں۔

قاری صاحب اور قاسم صاحب کی اس تصویر میں مولانا محمد فاروق بھی شامل ہوتے تو یہ تصویر ایک تاریخی دستاویز بن جاتی۔ اور ہم اس کا عنوان ''تین مُلا'' تجویز کرتے۔ کیوں کہ خاندانی اعتبار سے قاسم صاحب بھی ملاّ ہی تو ہیں، اور جماعتِ اسلامی سے اِن کی انسیت اور مولانا فاروق کے تئیں اِن کی عقیدت اسی ملائیت کی پیداوار ہے۔ حالیہ اِنتخابات میں قاری صاحب قاسم صاحب اور فاروق صاحب کی مفاہمت حادثہ نہیں بلکہ عشق باہمی کی کرامت تھی۔ اور مثل مشہور ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

......☆......

(۲۳/جون ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

قُریشی صاحب کا معافی نامہ

جولائی ۱۹۷۲ء کے ماہنامہ شبستان (نئی دہلی) میں ریلوے کے نائب وزیر محمد شفیع قریشی کا وہ معافی نامہ شائع ہوا ہے کہ جو ان کے اِس تاریخی انٹرویو سے متعلق ہے کہ جس کا ذکر ''آئینہ'' کی ۱۵ر مئی کی اشاعت میں اسی صفحے پر ہوا تھا۔ ہم اِس معافی نامے پر تبصرہ کرنے سے پہلے اِسے من وعن نقل کر رہے ہیں۔

''ماہ مئی کے شبستان میں آپ نے جو انٹرویو شائع کیا ہے اس کے لئے آپ کا مشکور ہوں۔ کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے کچھ نام غلط چھپ گئے ہیں۔

اِس انٹرویو میں کشمیر کے انتخابات کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس طریقہ سے اِسے پیش کیا گیا ہے اس سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ میرا ایک ہی مقصد یہ تھا کہ مخالف لوگ ہمیشہ عادتاً کشمیر کے انتخابات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حکومت کو بدنام کرنے کا یہ ایک حربہ وہ موقع بے موقع استعمال کرتے رہتے ہیں۔ شیخ صاحب کے دور میں انتخابات تو بالکل ہی نہیں ہوئے اور اگر ہوئے بھی تو وہ بھی نفی کے برابر۔ پھر اس عمل میں ان کے سیاسی مخالفوں نے انہیں بھی غیر منصفانہ بتایا۔ الیکشن کے دوران جو ماحول ملک

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں پیدا ہوتا ہے لازماً اس کا اثر کشمیر پر بھی پڑتا ہے۔ صادق صاحب کے دور میں جو بھی الیکشن ہوئے اِس میں مکمل آزادی دی گئی تھی اور پنچایت کے انتخابات میں مخالف پارٹیوں نے اپنے اُمیدوار میدان میں ڈال رکھے تھے۔ عوام نے ہر بار انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا اور بلا مقابلہ اُمیدواروں کی تعداد ہر الیکشن میں کم ہوتی گئی اور اب کے الیکشن میں صرف پانچ اُمیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ اِس سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ فضا میں عمل میں نہیں لائے گئے تھے۔ الیکشن کے دوران جن ایک دو واقعات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ تو انتخابی داؤ پیچ میں شامل ہیں اور ہر جگہ اِس قسم کے الزام لگائے جاتے ہیں، مگر اِس سے سارے الیکشن کو بدنام نہیں کیا جا سکتا۔ حالیہ انتخابات جو کشمیر میں ہوئے وہ اِس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ جمہوری طور اور طرز نے اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں۔ کیونکہ یہ انتخابات ایک آزادنہ اور منصفانہ ماحول میں روبہ عمل لائے گئے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے آئندہ شمارہ میں اِس خط کو چھاپ دیں گے۔'' (محمد شفیع قریشی۔ نائب وزیر ریلوے)

اِس معافی نامے کی شانِ نزول یہ ہے کہ مئی ۱۹۷۲ء کے شبستان میں قریشی صاحب کا ایک عدد انٹرویو شائع ہوا کہ جس میں انہوں نے ''پدرم سلطان بود'' کے عنوان سے اپنی ابتدائی زندگی کا خاکہ پیش کرنے کے بعد کشمیر کی سیاست اور سیاسی شخصیات پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا تھا۔ اِس انٹرویو میں موصوف نے اپنے ماضی کے کچھ تاریک گوشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق، تینوں پر کیچڑ اُچھالنے کی مذموم حرکت کی تھی اور شیخیاں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بگھارتے بگھارتے غیر ارادی طور پر اِس بات کا اعتراف کر گئے تھے کہ کشمیر میں آج تک جتنے انتخابات ہوئے ہیں، اِن سب میں بے ایمانی اور فراڈ کا عنصر غالب تھا۔ شیخ صاحب کو گالیاں دے دے کر تو وہ نائب وزیر بن گئے ہیں۔ لیکن ترنگ میں آکر انہوں نے بخشی صاحب اور صادق صاحب کو بھی نہ بخشا، اور اس طرح اُنہوں نے اپنی ذِلّت اور رسوائی کا سامان کر دیا۔ یہ معافی نامہ ان کی اِس حماقت کا نتیجہ ہے!

انٹرویو شائع ہونے کے فوراً بعد شمیم احمد شمیم نے وزیر اعظم مِسز اندرا گاندھی کے نام ایک خط میں ان کی توجہ قریشی صاحب کے اِس انٹرویو کی طرف دِلائی اور مِسز گاندھی کو جب انٹرویو کا متن پڑھ کر سنایا گیا، تو انہوں نے قریشی صاحب سے جواب طلب کیا، کہ انہیں اس پاکستان نواز اور حماقت آمیز انٹرویو کے لئے نائب وزیر سے پھر نائب تحصیلدار کیوں نہ بنایا جائے؟ ہمارے جاسوسوں کی اطلاع ہے کہ قریشی صاحب نے گڑگڑا کر اپنی غلطی کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اخبار نویسوں سے تو کیا، عرضی نویسوں سے بھی بات نہ کریں گے۔ شمیم صاحب نے مِسز گاندھی کے نام اپنے خط میں خاص طور سے یہ استفسار کیا تھا کہ کیا کشمیر میں انتخابات کے متعلق مسٹر قریشی کے تازہ انکشاف کے بعد حکومتِ ہند اپنے اِس موقف میں تبدیلی کا ارادہ رکھتی ہے کہ کشمیر میں چار بار آزادانہ ماحول میں انتخابات منعقد ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی تکلیف دہ اور شرمندہ کرنے والا سوال تھا اور مسٹر قریشی نے مرکزی کابینہ کے ایک رکن کی حیثیت سے انتخابات کو فراڈ کہہ کر مرکزی حکومت کو سخت مشکل میں ڈال دیا تھا۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مسز گاندھی، شمیم صاحب کے اِس سوال کا جواب کیا دیتیں، اُنہوں نے قریشی صاحب کو اِس نادانستہ حقیقت بیانی کے لئے وہ جھاڑ پلائی، کہ قریشی صاحب ساری عمر یاد رکھیں گے۔

اِدھر شمیم صاحب نے پارلیمنٹ میں بھی اِس انٹرویو کے بارے میں ایک عدد سوال پوچھ ڈالا اور وہ یہ کشمیر میں انتخابات کے متعلق نائب وزیر ریلوے محمد شفیع قریشی کے انکشاف کے متعلق حکومتِ ہند کا کیا ردِعمل ہے؟ یہ سوال جب قریشی صاحب کو بھیجا گیا، تو اُنہوں نے بدحواسی کے عالم میں انٹرویو سے ہی انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ قریشی صاحب کے اس انکار کی بنا پر سپیکر نے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے شمیم صاحب کا سوال Admit کرنے کی اجازت نہ دی تو اُنہوں نے 'شبستان' کے مدیر ادریس دہلوی سے دریافت کیا کہ کیا مسٹر قریشی نے اپنے انٹرویو کے متعلق انہیں کوئی خط یا مراسلہ بھیجا ہے اور ادریس دہلوی صاحب نے اُنہیں بتایا کہ قریشی صاحب نے چند دن قبل ٹیلی فون پر اِس خوبصورت انٹرویو کی اشاعت کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ مسٹر شمیم نے سپیکر کے نام ایک خط میں اِس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ مسٹر قریشی کی پرائیویٹ تردید کی بنیاد پر ان کا سوال Admit نہیں کیا جا رہا ہے اور اگر مسٹر قریشی اپنے بیانات کی تردید ہی کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں خفیہ طور انکار کرنے کی بجائے ایوان میں اِس کا برملا اظہار کرنا چاہیئے۔ ورنہ ''شبستان'' میں اپنا معافی نامہ شائع کرا کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ لوک سبھا کے سپیکر کی طرف سے شمیم صاحب کو ابھی تک اِن کے خط کا جواب نہیں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ملا ہے۔ لیکن قریشی صاحب کا معافی نامہ شائع ہو گیا ہے۔ یہ ہے اِس معافی نامے کی شانِ نزول! آئیے اب اِس عذر گناہ کی املا و انشاء اور گریمر پر ایک نظر ڈالیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریشی صاحب نے بڑی گھبراہٹ اور بدحواسی میں اپنا معافی نامہ مرتب کیا ہے اور اسی لئے اِس کا ایک جملہ دوسرے جملے سے ربط نہیں رکھتا۔ چراغ بیگ اُردو میں اچھی سدھ بدھ رکھتا ہے، لیکن قریشی صاحب کی اِس مختصر تحریر کو ایک نہیں، کئی بار پڑھ کر بھی اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اِس ایک جملے کو لیجئے ''مخالف لوگ عادتاً کشمیر کے انتخابات کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کون مخالف لوگ؟ کِس کے مخالف؟ اور پھر یہ ''عادتاً'' شک کی نگاہوں سے دیکھنا کیا ہوتا ہے؟''

دوسرا جملہ ملاحظہ فرمائیے ''شیخ صاحب کے دور میں انتخابات تو بالکل نہیں ہوئے، اور اگر ہوئے بھی تو وہ بھی نفی کے برابر۔'' اگر انتخابات ''بالکل'' نہیں ہوئے تو پھر یہ ''نفی کے برابر'' کیا ہوتا ہے۔ کیا مرکزی نائب وزیر کو لفظ ''بالکل'' کے معنی بھی معلوم نہیں؟ اور 'بالکل' کے ساتھ یہ 'نفی کے برابر' کیا چیز ہوتی ہے۔

قریشی صاحب کی بدحواسی کی ایک اور مثال پیش ہے۔ ''الیکشن کے دوران جو ماحول ملک میں پیدا ہوتا ہے، لازماً اِس کا اثر کشمیر پر بھی پڑتا ہے۔'' ہاں تو آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اور اس جملے کا آپ کے معافی نامے کے نفسِ مضمون سے کیا تعلق ہے؟ بڑی بدحواسی کا عالم ہے خدا خیر کرے۔

مزید ''گوہر افشانی'' ملاحظہ ہو۔ ''صادق صاحب کے دور میں جو بھی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

الیکشن ہوئے، اس میں مکمل آزادی دِی گئی تھی اور پنچایت کے انتخابات میں مخالف جماعتوں نے اپنے اُمیدوار میدان میں ڈال رکھے تھے۔''

انہی صادق صاحب کے متعلق قریشی صاحب نے اپنے انٹرویو میں یہ فرمایا تھا ''ان کے زمانے میں بھی نامزدگی کے زیادہ تر کاغذات بے ایمانی سے نامنظور کر دیئے جاتے تھے۔'' اور حق بات یہ ہے کہ قریشی صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا، خود وہ ۱۹۶۷ء میں پارلیمنٹ کے لئے اننت ناگ سے مخالفوں کے کاغذات نامزدگی رد کرا کر ہی منتخب ہوئے تھے۔ لیکن مِسز اندرا گاندھی کی مار اور پھٹکار کھا کر قریشی صاحب کو صادق صاحب کے دور میں آزادی ہی آزادی نظر آنے لگی اور ثبوت کے طور پر اُنہوں نے ''پنچایتی انتخابات'' کا ذکر کیا ہے کہ جن کے بارے میں مِسز گاندھی کو بھی معلوم ہے کہ وہ کھلم کھلا فراڈ تھے اور ہاں ''اپنے اُمیدوار میدان میں ڈال رکھتے تھے'' کونسی زبان ہے؟ اور کیا قریشی صاحب یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے، کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم کِس اُستاد سے اور کِس سکول میں حاصل کی تھی!

آگے چل کر قریشی صاحب نے ''گھری اندر اور میں باہر'' کے مصداق ایک اور دلچسپ اور معنی خیز اعتراف کیا ہے۔ کہتے ہیں ''الیکشن کے دوران جن ایک دو واقعات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ تو انتخابی داؤ پیچ میں شامل ہیں اور ہر جگہ اِس قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔'' اور یہ داؤ پیچ کیا ہیں؟ اِن کا ذکر قریشی صاحب نے تفصیل سے اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ ایک واقعہ اُنہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ بخشی صاحب کے وقت میں جب اُنہوں نے جانکی ناتھ بٹ کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مقابلے میں اسمبلی کا انتخاب لڑا تو وہ آٹھ سو ووٹوں سے جیت رہے تھے۔ لیکن ریٹرننگ افسر نے ان کی بجائے جانکی ناتھ بٹ کی کامیابی کا اعلان کیا۔ دوسری باران کے کاغذات نامزدگی ناجائز طور پر رد کردیئے گئے۔ یہ سب قریشی صاحب کی نگاہوں میں ''انتخابی داؤ پیچ'' ہیں۔ نائب وزیر صاحب! یہ اگر انتخابی داؤ پیچ ہیں تو یہ بتایئے انتخابی بے ایمانیاں اور دھاندلیاں کیا کیا چیز ہوتی ہیں؟ خود آپ کا فیصلہ یہ ہے کہ:

''شیخ صاحب اور بخشی صاحب کے زمانے میں کوئی بھی الیکشن ایمانداری اور انصاف کے ساتھ نہیں ہوا۔۔۔ بخشی صاحب نے ۱۹۶۷ء میں پہلی بار الیکشن لڑا۔ ہر الیکشن میں اکثر اراکین بلا مقابلہ کامیاب ہوجاتے تھے۔ یہ مذاق نہیں تو کیا تھا۔'' (شبستان۔ مئی ۱۹۷۲ء)

لیکن جب ''نوکری'' خطرے میں پڑ گئی، تو آپ کو یہ بے ایمانی یہ ناانصافی اور یہ مذاق انتخابی داؤ پیچ نظر آنے لگے۔ اُمیدواروں کے کاغذات نامزدگی میں سے حلف نامے چُرانا، اُمیدواروں کو اغوا کرنا، تجویز کنندوں کو حراست میں رکھنا، بیلٹ بکسوں میں چوری کے ووٹ ڈالنا۔ مخالف اُمیدواروں کے پولنگ ایجنٹوں کو۔۔۔ زدکوب کرکے پولنگ بوتھوں سے باہر کرنا، ڈپٹی کمشنروں اور ریٹرننگ افسروں کو شراب پلا کر اپنی بلا مقابلہ کامیابی کا اعلان کروانا۔ یہ سب ''انتخابی داؤ پیچ'' ہی تو ہیں اور ان ہی ''داؤ پیچوں کے سہارے ہندوستان نے ریاست جموں وکشمیر میں آزادانہ اور ایماندارانہ انتخابات کی طرح ڈالی ہے۔ جس ملک کو محمد شفیع قریشی جیسا وکیل اور ترجمان ملے، اس ملک کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

عزت اور آبرو کے مٹ جانے میں واقعی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ مقدمہ کسی عدالت میں ہوتا تو قریشی صاحب کو ''حلف دروغ'' میں چھ ماہ قیدِ سخت کی سزا ہو جاتی۔ لیکن مقدمہ چونکہ مسز اندرا گاندھی کی عدالت میں ہے جہاں عدل اور انصاف کے انوکھے معیار مقرر ہیں۔ اس لئے تعجب نہیں کہ قریشی صاحب کو اپنی دروغ گوئی کے لئے ترقی دے کر نائب وزیر سے وزیر بنا دیا جائے!

قطع نظر اس کے کہ قریشی صاحب کے معافی نامے سے ان کے خیالات کی بے ربطی اور بد حواسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بات بجائے خود اہم ہے کہ مرکزی وزارت کا ایک نائب وزیر اردو کے دو جملے بھی ٹھیک سے نہیں لکھ سکتا۔ اُسے نہ اپنے جذبات پر قابو ہے اور نہ خیالات کے اظہار پر قدرت۔ ''شبستان'' میں شائع شدہ یہ مراسلہ نہ معلوم انہوں نے کتنی محنت اور ریاضت سے لکھا ہوگا۔ لیکن اس سے ان کے گناہوں کا میل دھلنے کی بجائے اور گہرا ہو گیا ہے۔ اور ان کی فکری بد دیانتی کے ساتھ ساتھ ان کی ''قابلیت'' کا بھرم بھی کھل گیا ہے۔ ایسے ''لائق'' لوگ جن سنگھیوں کی زبان بول کر اپنی وفاداری، تابعداری اور فرمانبرداری کا ثبوت مہیا نہ کریں تو اُنہیں ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہ کیا جائے۔ قریشی صاحب کی اطلاع کے لئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی تردید نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی بجائے اسے اور زیادہ بے نقاب کر دیا ہے۔

......☆......

(جون ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

محکمۂ سیاحت کے لئے لمحۂ فکریہ!

میں یہ بات کئی بار کہہ چکا ہوں، اور آج اسے پھر دہرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ کشمیر کی خوبصورتی قدرت کی دین ہے محکمۂ سیاحت کا تحفہ نہیں۔ کشمیر کے ندی، نالے، جھیل اور جھرنے، پہاڑ اور پہاڑیاں محکمۂ سیاحت کے وجود میں آنے سے پہلے ہی موجود تھے، اور اس دولتِ خداداد کے تحفظ اور تزئین کے لئے ہی سیاحت کا محکمہ قائم کیا گیا تھا۔ لیکن جس طمطراق اور دھوم دھام سے ریاست کا محکمہ سیاحت ہر سال کشمیر کی سیر کو آنے والے سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے اعداد و شمار شائع کرتا ہے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ سیاحوں کی یہ بڑھتی ہوئی تعداد، کشمیر کے قدرتی حسن اور مناظر فطرت کی رنگینیوں اور رعنائیوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ محکمۂ سیاحت کی کوششوں کی وجہ سے کشمیر کے سفر پر آمادہ ہوتی ہے۔ محکمۂ سیاحت کے بڑے بڑے افسر واقعی اِس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ملک کی طرف سے زرِ کثیر صرف کر کے اشتہارات شائع کرنے سے ہی دُنیا بھر کے لوگوں کو کشمیر دیکھنے کی تحریک اور ترغیب ملتی ہے۔ محکمے کے لال بجھکڑوں کی اس خوش فہمی کو دور کرنے کے لئے چراغ بیگ کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اس کے لئے کافی وقت پڑا ہے۔ فی الحال میں محکمۂ سیاحت کے سربراہوں کی توجہ اِس امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اگر کشمیر کے قدرتی حسن میں کسی قسم کی آرائش یا اضافہ نہیں کر سکتے، تو کم از کم اس کو برقرار رکھنے کے لئے ہی چار پیسے صرف کریں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق کشمیر کی بڑی بڑی جھیلیں نہ صرف یہ کہ اپنی گہرائی اور خوبصورتی سے محروم ہورہی ہیں، بلکہ جھیلوں کی حیثیت سے ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔

میر شوکت حسین نام کے ایک ریسرچ سکالر نے دعویٰ کیا ہے کہ ان جھیلوں کی تہہ میں بڑھتی ہوئی خودرو گھاس پھوس کی پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے دلدل میں تبدیل ہونے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ میر صاحب کا خیال ہے کہ اس قسم کی پیداوار نہ صرف جھیلوں کی خوبصورتی کو ختم کر دے گی، بلکہ جھیلوں کی پرورش اور زندگی کے لئے بھی خطرے کا باعث بن جائیگی۔ اس طرح ان میں سے کشتی چلانا تو کیا چپّو چلانا بھی ناممکن ہوگا۔ میں میر شوکت حسین کے اِس اندازے سے سو فیصدی متفق ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اندازہ کرنے کے لئے ریسرچ سکالر ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے سری نگر کی آبرو 'جھیل ڈل' کو لُٹتے دیکھا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس جھیل میں مکانات کی تعمیر کرنے کی ہوا چل پڑی۔ اور بارسوخ لوگوں نے اس خوبصورت جھیل کے خوبصورت ترین حصوں کو مٹی سے پاٹ کر اس پر عشرت کدے تعمیر کئے۔ حکومت کو ہوش نہ آتا تو اب تک ساری جھیل کو پاٹ کر اس پر ایک نیا شہر آباد ہوگیا ہوتا۔ میری اطلاع ہے کہ چوری چھپے اب بھی یہ سلسلہ جاری

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔ ہاؤس بوٹوں کی بڑھتی ہوئی تعدادِ اور گندے پانی کے نکاس Drainage کی عدم موجودگی نے اس جھیل کو دنیا کی سب سے گندی، بدبودار اور مُضرِ صحت جھیل بنا دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ سری نگر کی خوبصورتی کی سب سے جاندار علامت، جھیل ڈل، اپنی غلاظت، عفونت اور سڑاند کی وجہ سے سیاحوں کی دلچسپی کی بجائے ان کی حقارت کی مرکز بن گئی ہے۔ شوکت حسین صاحب کے انکشاف نے اب ایک اور خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے اور اگر جھیل کی تہہ میں اگنے والی قسم قسم کی جھاڑیوں کو صاف کرنے کی طرف فوری توجہ نہیں دی گئی تو ڈل اور مانسبل کی جھیلیں دلدل میں تبدیل ہو جائیں گی۔ پیشتر اس کے کہ کشمیر خوبصورت جھیلوں کی بجائے دنیا بھر میں دلدلوں اور مچھروں کے لئے مشہور ہو جائے، محکمۂ سیاحت کے مچھروں کو اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئیے۔ ورنہ کشمیر کے عوام انہیں، انہی دلدلوں میں غرق کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شکایت کا فقدان

معلوم نہیں، کہ کشمیر میں کتنے لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ سید میر قاسم کی حکومت نے ریاست سے رشوت ستانی، بدانتظامی اور بدعنوانی کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک کمشنر کا عہدہ قائم کیا ہے اور اس کمشنر کا نام ہی ''کمشنر شکایات'' Grievance Commissioner رکھا گیا ہے۔ اس عہدے کو قائم ہوئے ٹھیک ایک سال ہو گیا ہے۔ اور اس پر عرصہ آٹھ ماہ سے ایک صاحب کا تقرر بھی ہو گیا ہے، لیکن اس ایک سال کے عرصے میں ابھی تک قاسم صاحب کی حکومت یہ فیصلہ نہیں کر پائی ہے کہ کمشنر صاحب کا کام کیا ہوگا اور وہ اسے کس طرح انجام دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ایک سال میں ''شکایات کے کمشنر'' کو تنخواہ تو باقاعدہ مل رہی ہے، لیکن ابھی تک کوئی کام نہیں مل رہا ہے۔ خوش قسمتی ہے اس اہم اور باوقار عہدے کے لئے جس افسر کو منتخب کیا گیا ہے، وہ اپنی ایمانداری، دیانت داری اور صاف گوئی کے لئے مشہور ہی نہیں بدنام بھی ہے۔ اور ان کے تقرر سے جائز طور پر یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ وہ سرکاری افسروں اور عام لوگوں کی شکایات کا ازالہ کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوں گے۔ لیکن ایسا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

معلوم ہوتا ہے کہ عہدہ قائم کرنے اور افسر کا تقرر کرنے کے بعد قاسم صاحب کو اِس بات کا احساس ہو گیا کہ انہوں نے کوئی بہت بڑی غلطی کی ہے، ان کے کئی ساتھیوں نے انہیں ان خطرات سے آگاہ کیا، کہ جو اِس قسم کے ''ادارے'' سے پیدا ہو سکتے ہیں اور جن کا بعد میں تدارک کرنا ممکن نہ ہوگا۔ ان کے مشیروں نے انہیں بتایا کہ ریاست کے انتظامیہ میں رشوت ستانی اور بدعنوانی، اب کوئی جرم یا قابلِ اعتراض بات نہیں سمجھی جاتی اور اوپر سے نیچے تک قدم قدم پر نذرو نیاز، بے ایمانی، بدعنوانی اور اقربا پروری کا وہ عالم ہے کہ اگر 'کمشنر شکایات' نے اپنی دیانتداری کے زعم میں اس نظام سے کسی قسم کی چھیڑ خانی کی تو حکومت کا سارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ بڑے بڑے افسروں نے کمشنر کے تقرر کو اپنی من مانیوں اور لن ترانیوں کے لئے ایک خطرۂ عظیم سمجھ کر اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی ہے۔ بے ایمان سیکریٹریوں، بدکردار افسروں اور بد چلن سیاستدانوں نے مل کر ''کمشنر شکایات'' کو آج ایک سال سے عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا ہے، اور سید میر قاسم اپنی نیک نیتی کے باوجود اس مکروہ سازش کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ ''کمشنر شکایات'' اپنے خالی خولی دفتر میں دن بھر غوں غاں کر کے اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب چراغ بیگ کو جموں سکریٹریٹ میں ان کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا، تو کمشنر صاحب کی 'صاف وشفاف' میز دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی، اس میز پر قلم و دوات کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے دریافت کیا، کہ کیا اس ریاست میں کسی کو کوئی شکایت نہیں؟ کیا قاسم صاحب کے بر سر اقتدار آتے ہی تمام لوگوں کو شکایات دور ہو گئیں؟ تو کمشنر صاحب نے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مُسکراتے ہوئے جواب دیا کہ یہی سمجھ لیجئے۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک کمشنر کے طریق کار اور حدِ اختیار کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ یہ فیصلہ اگر ایک سال میں نہیں ہوا ہے، تو یقیناً کبھی نہیں ہوگا۔ بے ایمان بیوروکریسی اور بدچلن سیاست ہر اس محتسب کے خلاف ہوتی ہے، کہ جوان کی گمراہی اور بے راہ روی پر اُنگلی اٹھانے کی ہمت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ''کمشنر شکایات محمد امین۔'' اپنے کندھوں پر اپنی ایمانداری کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے بوڑھے ہو جائیں گے، لیکن انہیں کوئی کام نہیں دیا جائے گا۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے دفتر میں مصلّیٰ بچھا کر اِس بدقسمت ریاست کے عوام کے حق میں دعا کریں اور اپنی اِس دعا کے لئے سرکار سے ماہانہ تنخواہ اور ترقی کا مطالبہ کریں۔

......☆......

(۳۱ر مارچ ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہندو اکثریت کو خطرہ

چراغ بیگ کو آل انڈیا انٹی فیملی پلاننگ ایکشن کمیٹی (اس مرحلے پر مجھے اپنے ہاں کی عوامی ایکشن کمیٹی یاد آ رہی ہے) کے صدر مسٹر سدھیر لکشمن ہندرا، بی اے، ایل ایل بی، گوالیار ٹینک بمبئی کی طرف سے ایک چھپا ہوا پوسٹ کارڈ ملا ہے، جس کا متن یوں ہے۔

''شاید آپ کوئی ہندو ایم۔ پی/ ایم۔ ایل۔ اے یا صحافی ہوں، اور اِس منصب پر صرف اس لئے پہنچ گئے ہیں کہ معصوم اور نادان ہندوؤں نے آپ کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے منتخب کیا ہے، مگر آپ بڑے خود غرض، بے اصول اور غدار ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ آپ نے ہندو عوام کے مفادات کے تحفظ کے لئے کوئی کام نہیں کیا ہے، ایک گناہ آپ نے یہ کیا ہے کہ آپ نے حکومت کو لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندوؤں کی نس بندی کی اجازت دیدی جبکہ مسلمان اور عیسائی فیملی پلاننگ سے گریز کرتے رہے، اس کے نتائج ۱۹۷۱ء کی مردم شماری سے واضح ہوگئے ہیں۔

آپ کو اپنی نامرادی اور نامردی پر شرمندہ ہونا چاہئیے، کہ آپ کی وجہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے مسلمانوں کو کئی شادیاں کرنے کی اجازت ہے اور آپ نے اِس رعایت کو ختم کرانے کے لئے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے۔ کیا غضب ہے کہ سپریم کورٹ کے تین ججوں نے دو ہندو نوجوانوں اور ان کے باپ کو ایک سے زیادہ بیوی کے جرم میں سزا دی، جبکہ لاکھوں مسلمان کثرتِ ازدواج کے حق سے مستفید ہو رہے ہیں۔ پس اس طرح آپ قانون کے سامنے سب کی برابری کے اصول کو قربان کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ اس حکومت کے لئے ہندوؤں کی نسل کشی میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ حکومت ابھی تک فیملی پلاننگ کے نامراد منصوبے پر ۳۰۰ کروڑ سے زائد روپیہ برباد کر چکی ہے اور تعجب ہے کہ آپ یہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کر رہے ہیں۔ ہندوؤں کی نسل کشی کی اس مذموم سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے یہ ایکشن کمیٹی قائم کی ہے، کیونکہ اگر فوراً اِس سازش کا قلع قمع نہ کیا گیا، تو ہم سال ۲۰۵۱ میں اقلیت بن جائیں گے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کو بدستور اکثریت میں رکھنے کے اس مقدس منصوبے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے پانچ روپے کا منی آڈر فوراً بھیج دیجئے اور ہمارے اس خط کو اپنے دس دوستوں تک پہنچا دیجئے۔''

چراغ بیگ غریب آدمی ہے۔ پانچ روپے کی رقم تو نہیں بھیج سکتا، لیکن دس دوستوں کی بجائے ''آئینہ'' کے دس ہزار قارئین تک یہ خط پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا ہے۔ امید ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ سدھیر صاحب کی اپیل پر کان دھر کر ہندوؤں کو ۲۰۵۱ء میں اقلیت بن جانے سے بچانے کی کوشش کریں گے!۔

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گرم روی سے نرم روی تک

ابھی حال ہی جب ریاستی سرکار ولد مرکزی حکومت نے شیخ محمد عبداللہ کے ریاست میں داخلے پر پابندی کے احکامات منسوخ کیئے، تو ہمارے ہاں کے بہت سے پیشہ ور بیان باز لیڈروں نے وزیراعلیٰ سید میر قاسم کو اس "جرأت مندانہ" فیصلے پر مبارک باد دیتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا، اور آپ کو حیرت ہوگی کہ مبارک باد دینے والوں میں مولینا فاروق جیسے کم سن اور مرزا افضل بیگ جیسے پیرانہ سال رہنما بھی شامل تھے۔ چراغ بیگ نے بہت سوچا، لیکن اسے قاسم صاحب کو مبارک باد دینے یا ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کوئی جواز نظر نہ آیا۔ اور اسی لئے جب تمام کانگریسی غیر کانگریسی، محاذی، غیر محاذی، عاقل اور فاطر العقل قاسم صاحب کو مبارک بادی کی مٹھائی بیچ رہے تھے، تو میں "آئینہ" کے دفتر میں بیٹھ کر اس ملک کی تقدیر پر آنسو بہا رہا تھا۔

کوئی جیب کترا آپ کی جیب کاٹ لے۔ اور پھر ڈیڑھ دو سال بعد وہ آپ کا روپیہ واپس کیئے بغیر آپ سے ہاتھ ملائے، تو کیا آپ اسی کا شکریہ ادا کریں گے؟ کوئی غاصب آپ کی زمین پر زبردستی قبضہ کر کے سال ڈیڑھ سال کے لئے آپ کو اس کی فصل سے محروم کردے۔ اور پھر قانونی اور اخلاقی دباؤ کے نتیجے میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

زمین خالی کردے تو کیا آپ اسے مبارک باد دیں گے؟ کوئی چور اُچکا آپ کے گھر میں گھُس کر آپ کا قیمتی سامان چُرائے اور پھر پولیس اس کے ہاں سے مال مسروقہ برآمد کر کے آپ کے حوالے کر دے تو کیا آپ چور کے ہاں جا کر اُس کا شکریہ ادا کریں گے؟ کوئی اعلیٰ پولیس آفیسر آپ کے باغ میں، میووں کی پوری فصل زبردستی اُتار کر لے جائے، اور آپ کو بغیر کسی جُرم کے حراست میں رکھے، اور پھر ایک دن آپ کو رہا کر دے تو کیا آپ اس زیادتی اور ناانصافی کے لئے اس کے شکریہ ادا کریں گے یا اس سے مبارک باد دیں گے؟ عام زندگی میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن سیاسی اکھاڑے میں اس قسم کی اداکاری اور ریاکاری عام ہے!

شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ اور جی ایم شاہ کو خواجہ غلام محمد صادق کی حکومت نے جنوری ۱۹۷۱ء میں بغیر کسی قانونی وجہ یا جواز کے جلائے وطن کر دیا۔ موجودہ وزیراعلیٰ سید میر قاسم اُن دنوں صرف وزیر تھے اور وزیراعلیٰ بننے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ وزیراعلیٰ بننے سے پہلے اُنہوں نے شیخ صاحب اور اُنکے ساتھیوں کی جلائے وطنی کی ذمہ داری بجا طور پر، خواجہ غلام محمد صادق مرحوم پر ڈال دی۔ لیکن وزیراعلیٰ بننے کے بعد اُنہوں نے اپنے کرتب دکھا کر نہ صرف شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں پر عائد شدہ پابندی کی توثیق کر دی، بلکہ بیگم عبداللہ کے ریاست میں داخلے پر بھی پابندی عائد کر دی۔ اس کے ساتھ ہی انتخابی امتحان میں پاس ہونے کے لئے نگران عملے کے اہم اراکین، مولانا مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ کو نظر بند کر دیا۔ تا کہ کانگریسی اُمیدوار کھلے بندوں ''نقل'' کر کے کامیاب ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام اقدامات سرکاری غنڈہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گردی اور سیاسی لفنگا پن کی بدترین مثالیں تھیں۔لیکن انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جب نرم وصادق کے گرم رو جانشین کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب اس کا ''تختِ طاوس'' محفوظ ہے تو اس نے بھی اپنے سخت چہرے پر نرم روی کا غازہ ملنا شروع کر دیا۔سب سے پہلے بیگم عبداللہ کے داخلے پر عائد شدہ پابندی ہٹادی گئی۔ بیان باز لیڈروں نے تالیاں بجا بجا کر مبارک بادی۔ اس کے ساتھ ہی مسعودی اور قرہ کو بھی رہا کر دیا گیا۔خوشامدیوں نے واہ واہ کے نعرے بلند کیئے۔ پھر مرزا افضل بیگ اور شاہ پر سے پابندی ہٹادی گئی۔اوراب کی بار شکریہ ادا کرنے والوں میں مرزا افضل بیگ بھی شامل ہو گئے۔اب شیخ عبداللہ پر سے پابندی ہٹادی گئی ہے تو ماسوائے شیخ عبداللہ اور چراغ بیگ، سبھی لیڈر پلیڈر قاسم صاحب کو مبارک باد دے رہے ہیں! میں پوچھتا ہوں کہ یہ مبارک باد کس لئے؟ قاسم صاحب اور ان کے پیشروؤں نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے کچھ ظلم، زیادتیاں اور ناانصافیاں کی تھیں۔اقتدار کے جائز وارثوں کی زبانوں پر تالے اور پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔اب جب کہ ان کا اقتدار مستحکم ہو گیا ہے۔انہیں نہ کسی کو جلاوطن کرنے کی ضرورت ہے اور نہ نظر بند کرنے کی اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ظلم، زیادتی اور ناانصافی کے تمام نشانات مٹا دیے جائیں تاکہ دُنیا کو یہ یاد نہ رہے، کہ ان کے اقتدار کی بنیادیں کیا ہیں۔قاسم صاحب کی ان عیارانہ کوششوں کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنے یا انہیں مبارک باد دینے کا اخلاقی جواز کیا ہے میں بار بار سوچنے پر بھی نہیں سمجھ سکا ہوں! میرا خیال ہے کہ اس موقعے پر قاسم صاحب کی فرعونیت اور آمریت کا پوسٹ مارٹم کر کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

انہیں یہ یاد دلانا چاہیے کہ وہ اپنے چہرے پر نرم روی کا غازہ مل کر اس نظام کی بدصورتی کو چھپا نہیں سکتے۔ کہ جس کے سہارے وہ زندہ ہیں مبارک باد دینے والے لیڈروں کو ان سے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ شیخ عبداللہ کو کیوں جلاوطن کیا گیا تھا اور آج انہیں وطن لوٹنے کی اجازت کیوں دی جارہی ہے۔

سید میر قاسم نے چوری کے بعد بڑی سینہ زوری کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ پر سے پابندی کے احکامات منسوخ کرنا، نرم روی کی پالیسی کا ایک حصّہ ہے۔ میرے خیال میں یہ بیان مضحکہ خیز ہی نہیں، توہین آمیز بھی ہے۔ اُنہوں نے شیخ صاحب سے اپیل کی ہے کہ وہ ریاست کے تعمیری کاموں میں حصّہ لے کر اسے خوش حال بنانے کے کام میں شریک ہوں اس اپیل کا مقصد شیخ صاحب کو مشتعل اور ریاستی عوام کے جذبات کو مجروح کرنے کے سواء کچھ نہیں............ ایک شخص کو بغیر کسی وجہ یا جرم کے اس کی آزادی سے محروم کیا جاتا ہے اور اس کا نام 'نرم روی' رکھا جاتا ہے۔ پھر اپنے ناپاک مقصد حاصل کرنے کے بعد اسے آزاد کردیا جاتا ہے۔ تو اس کا نام نرم روی کی توسیع رکھا جاتا ہے۔ ایک شخص انتخابات میں حصّہ لے کر اپنے بنیادی حقوق کا استعمال کرنا چاہتا ہے، تو اسے اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے اور جب پھر اسے یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ قومی تعمیر میں حصّہ لے کر ملک کو خوشحال بنائے۔ یہ ستم ظریفی ہی نہیں۔ بدترین قسم کی ریاکاری اور انتہائی مکروہ قسم کی ایذا پرستی ہے۔ اس کا مقصد زخموں پر نمک چھڑکنے کے سواء کچھ نہیں اور قاسم صاحب کو مبارکباد دینے والوں کو یہ نہیں بھولنا نہیں چاہیے کہ وہ غیر ارادی طور پر اس چھڑکاؤ میں شریک ہورہے ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بے وقت موت

۱۹۷۲ء میں یوں تو کئی حادثات اور سانحات رونما ہوئے، لیکن چراغ بیگ کی نگاہوں میں سب سے بڑا سانحہ ۹۴ رسالہ ''نوجوان'' چکروتی راج گوپال آچاریہ کی متوقع ، مگر بے وقت موت ہے، راجہ جی' جسمانی اعتبار سے نحیف، کمزور اور لاغر ہو چکے تھے لیکن اِن کا ذہن ان کی فکر اور ان کے حواس حیرت انگیز حد تک صحت مند تھے، آدمی عام طور پر ساٹھ ستر تک پہنچتے پہنچتے سٹھیا جاتا ہے۔ لیکن راجہ جی ۹۴ سال کی عمر میں بھی نوجوان سے زیادہ ہوش منداور روشن دماغ تھے، وہ عمر کی اِس منزل میں پہنچ چکے تھے کہ جہاں سے موت کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود میں نے ان کی موت کو بے وقت کہا ہے۔ اِس لئے کہ ذہنی طور وہ ابھی جوان تھے، ان کا دل زندہ تھا، ان کی فکر توانا تھی، اور ان کے تخلیقی سوتے ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کا ضمیر تھے، اور ان کے وجود سے اِس ملک کی اخلاقی طاقت کا بھرم قائیم تھا، وہ کچھ دیر اور زندہ رہتے، تو شائد ہماری کمزوریاں اور ہماری بے اعتدالیاں، ہمارا گھمنڈ اور غُرور، ہماری خودنمائی اور خود فریبی، خودستائی اور کم نگاہی، ہماری آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بجائے ہمارے لئے سرمۂ بصیرت بن جاتیں، وہ گاندھی جی کے بعد پہلے ہندوستانی رہنما تھے کہ جو حق بات کہنے کے لئے زندگی کی خوشیاں ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی قربان کرنے کیلئے بھی تیار تھے، اور یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کبھی کوئی ناروا سمجھوتہ نہیں کیا اور جس بات کو حق سمجھا، اِس پر نتائج سے بے پرواہ ہو کر اٹل رہے۔ اُنہوں نے گاندھی جی سے بھی اختلاف کیا، اور جواہر لال نہرو کی طرح صرف اختلاف ہی نہیں، بلکہ اپنی بات پر ڈٹ کر گاندھی جی سے علیحدہ بھی ہوئے۔ ان کی دُور اندیشی کا یہ عالم تھا، کہ جب جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد، جیسے دیدہ ورانِ سیاست کے لئے پاکستان کا مطالبہ دیوانے کے خواب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ راجہ جی کی دُور بین نگاہوں نے اِس مطالبے کی ''ناگزیریت'' کو محسوس کر کے کانگریسی رہناؤں کو یہ مشورہ دیا تھا، کہ وہ اصولی طور پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کر لیں۔ اِس وقت سارے ملک نے راجہ جی کو جناح کا ایجنٹ قرار دیکر ان کا مذاق اڑایا تھا۔ لیکن صرف کچھ سال بعد تاریخ نے راجہ جی کی دُور اندیشی اور دانش مندی پر مہر تصدیق ثبت کر کے ان کا مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑایا۔ راجہ جی کا اصل سرمایہ ان کی اخلاقی جرأت دیانت اور حقیقت پسندی تھی، وہ اعتقاداً کٹر ہندو تھے۔ لیکن ایسے ہندو کہ ان کی دیانت شرافت، صداقت اور قیادت پر ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کو وشواس تھا۔ اِن میں کھُل کر اختلاف کرنے کی ہمت اور اپنی بات منوانے کی صلاحیت تھی۔ اور ایک ایسے ملک میں کہ جہاں مذہب پاؤں کی زنجیر اور اندھے کی تقدیر کا دوسرا نام ہے۔ راجہ جی نے کبھی اپنے مذہبی اعتقاد کو

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اپنی آزادیٔ فکر اور انصاف پسندی کو راہ میں حائل نہیں ہونے دیا، کئی بار حق بات کہنے کے لئے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی، لیکن مجال ہے، جوان کی پیشانی پر کبھی بل آیا ہو، اپنی عظمت، وقار اور مرتبے کے اعتبار سے انہیں آزاد ہندوستان کا صدر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہ ہندوستان کے آخری گورنر جنرل ثابت ہوئے۔ اور اس کے بعد حکمرانوں نے انہیں کھلونے دیکر بہلانے کی ہی کوشش کی، راجہ جی چاہتے تو وہ ہندوستان کے صدر بھی ہو سکتے تھے، لیکن انہیں ہندوستان کی صدارت سے زیادہ ہندوستان کا ضمیر بننے کی خواہش تھی، اور وہ آخری دم تک اپنے اس منصب پر قائم رہے۔ ہندوستان کے حاکموں نے جب بھی طاقت کے غُرور اور حکمرانی کے نشے میں کوئی غلط قدم اُٹھایا۔ راجہ جی نے اِس کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ان کے کئی فیصلوں پر سخت تنقید کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کی دیانت، اِن کے خلوص اور اَن کے مقصد پر حرف گیری کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی۔ اُنہوں نے گوا پر ہندوستانی فوجی کاروائی کی سخت الفاظ میں مذمت کی، اور باوجود اِس کے کہ ہندوستان کی حکومت اور عوام کی اکثریت اِن کے اِس روّیے پر ناراض تھی، اُنہوں نے اِس کی کوئی پروا نہیں کی۔ کشمیر کے معاملے میں ان کا شروع سے ہی یہ موقف رہا ہے کہ ہم نے کشمیری عوام سے جو وعدے کئے ہیں انہیں پُورا کئے بغیر ہم کشمیر کو اپنے ساتھ رکھنے میں حق بجانب نہیں ہیں اور وہ آخری دم تک اپنے اِس موقف پر قائم رہے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے بحُران کے دوران، جب کشمیر میں رائے شماری کا مطالبہ کرنیوالے بہت سے کشمیری لیڈروں نے بھی رائے شماری کو ناقابلِ عمل

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اور غیر ضروری قرار دے کر یہ مطالبہ ترک کر دیا تھا، راجہ جی نے اپنے ہفت روزہ "سوراجیہ" میں کشمیر میں رائے شماری کرنیکا سجھاؤ پیش کیا تھا۔ ان کے خیال میں ہندوستان اپنے وعدوں سے منحرف ہو کر اپنی اخلاقی حیثیت کر کمزور کر رہا تھا۔ قطع نظر اِس کے کہ راجہ جی کی تجویز قابلِ عمل ہے یا نہیں، یہ بات بجائے خود قابلِ تعریف ہے، کہ ہندوستان کے ۵۵ کروڑ قوم پرستوں میں ایک ایسا بھی شخص موجود تھا کہ جو اپنے ملک کی ہر غلط یا صحیح بات کی حمایت کرنے کے لئے تیار نہ تھا، اور جس کے لئے عوامی مقبولیت اور سرکاری خوشنودی سے زیادہ اصول اور ضمیر زیادہ اہم تھے۔ اُنہوں نے ہمیشہ کشمیری عوام کیساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور اپنی نگارشات میں ہمیشہ اِس بات پر زور دیتے رہے، کہ ہم کشمیر کو طاقت کے ذریعے ہندوستان کا حصہ نہیں بنا سکتے، وہ فرد کی آزادی اور عظمت دونوں کے قائل تھے اور اس کے علمبردار بھی، اور یہی وجہ ہے، کہ انہیں کمیونزم کا اجتماعیت کا فیصلہ کبھی راس نہیں آیا۔ عمر کی اِس منزل میں کہ جب آدمی دُنیا سے بیزار ہو کر آخرت کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ راجہ جی نے سوتنتر پارٹی قائیم کر کے اپنے سیاسی نظریات کو فروغ دینا چاہا، وہ کسی حد تک تو اس میں کامیاب رہے۔ لیکن بالآخر سوتنتر پارٹی وقت کے ہاتھوں شکست کھا کر ان کی زندگی میں ہی مرحوم نظر آنے لگی۔ لیکن راجہ جی کی اِس ناکامی پر بھی میر کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے میر۔ مقابلہ تو دِلِ ناتواں نے خوب کیا۔ راجہ جی کی ساری زندگی ظلم، ناانصافی، جبر اور تشدّد کے خلاف جہاد کرنے میں صرف ہوئی۔ اور اِس وقت جبکہ ملک میں ناانصافی اور جبر و تشدّد کا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دور دورہ ہے۔ اِس ملک کو راجہ جی جیسے بہت سے راجاؤں کی ضرورت ہے اور اِسی لئے میں نے ان کی موت کو متوقع ہونے کے باوجود بے وقت کہا۔ راجہ جی جیسے نوجوان صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی موت نے ہندوستان کو اِس کے ضمیر سے محروم کر دیا ہے۔ کیا جے کاش نرائن اِس خلاء کو پُورا کر سکیں گے۔؟

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آلو اور گولی

کچھ عرصے سے کشمیری لیڈروں اور مرکزی حکومت کے درمیان ریاست کی اندرونی خودمختاری کے سوال پر تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ اگرچہ مرکزی لیڈروں کی طرف سے اِس سلسلے میں ابھی تک مکمل خاموشی برتی جارہی ہے۔ لیکن شیرِ کشمیر اور فخرِ کشمیر ہر دوسرے دن عوام کو یہ یقین دِلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بات چیت تسلی بخش طریقے پر جاری ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق کشمیری لیڈروں اور مرکزی حکومت کے درمیان اختلافات کی خلیج رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے اور حکومت ہند نے اصولی طور پر ''اندرونی خودمختاری'' کا مطالبہ تسلیم کیا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور چراغ بیگ، جو ابتداء سے ہی ''اندرونی خودمختاری'' کا حامی اور علمبردار رہا ہے۔ اِس خوش کُن خبر سے بہت خوش ہے۔ لیکن اِس خوشی کے موقع پر عوام الناس کو اِس تلخ حقیقت سے بھی آشنا کرنا چاہتا ہے کہ اندرونی خودمختاری کے پھولوں کے ساتھ کچھ کانٹے بھی ہوں گے۔ جن کی چھبن برداشت کرنے کے لئے انہیں تیار رہنا چاہیئے۔

مکمل اندرونی خودمختاری کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہماری ریاست کو مرکز سے صرف

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

وہی امداد ملے گی، کہ جس کی وہ ازروئے آئین اور قانون مستحق ہے اور ہمیں ریاست کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ اندرونی وسائل فراہم کرنے ہوں گے۔ بالفاظ دیگر ہمیں اپنے آپ کو اندرونی خودمختاری کے اہل ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی قربانیاں دینا ہونگی اور مرکز کی خیرات پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔ مثلاً صرف شہر اور قصبوں کو سستے چاول مہیا کرنے کے لئے سالانہ گیارہ کروڑ روپے کی عیاشی اِس وقت برداشت نہیں کی جاسکتی، کہ جب ہم اندرونی طور پر مکمل خودمختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے اور سستے چاوّل کھانے والے شہریوں کو ابھی سے اپنے آپ کو اِس قربانی کے لیے تیار کرنا پڑے گا۔ کہ جب ساری ذمہ داری ہمارے اپنے کاندھوں پر آپڑے گی، تو پھر گیارہ کروڑ روپے کا بوجھ حکومت پر نہیں، ان کہ اپنی جیبوں پر پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ''اندرونی خودمختاری'' کے لیے ریاستی عوام یہ معمولی سی قربانی دینے کی لیے تیار ہوں گے۔

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

زوال وعروج کی کہانی

تین سال قبل درگا پرشاد در کے ماسکو میں ہندوستان کا سفیر متعین ہونے پر چراغ بیگ نے ان کا جو مرثیہ لکھا تھا، اس کا عنوان تھا ''عروج وزوال کی کہانی'' اور آج تین سال بعد در صاحب جس طمطراق اور دھوم دھام سے ہندوستان لوٹ آئے ہیں، اس نے میرے ہی نہیں بہت سے لوگوں کے اندازے غلط ثابت کردئے ہیں اور مجھے محسوس ہورہا ہے کہ در صاحب کی کہانی کا عنوان بدلنے کی ضرورت ہے۔ صرف عنوان! اب ان کی کہانی کے لئے ''زوال وعروج کی کہانی'' کا عنوان زیادہ موزون رہے گا!

تین برس تک روس کے صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد دُرگا پرشاد در آج مرکزی حکومت میں ایک نہایت اہم اور کلیدی منصب پر فائز کردئے گئے ہیں۔ وہ خارجی پالیسی، سراغرسانی اور بنگلہ دیش کے متعلق حکومت کی پالیسی ساز کمیٹی کے سربراہ ہیں اور بہت سے وزیر اور سفیران کے عروج اور وجود سے خائف نظر آتے ہیں۔ خود درگا پرشاد در بھی حیران ہونگے، کہ وہ کیا سے کیا ہوگئے ہیں۔ سیاسیات کشمیر کا پٹا ہوا مہرہ، جنت کشمیر سے نکلا ہوا آدم، اپنے ہر دوست کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ساتھ دغا کرنے والا مجرم، جسے اپنے گناہوں کی پاداش میں سائبیریا بھیج دیا گیا تھا۔ اپنے قید کی معیاد پوری کرتے ہی، آدھا درجن سے بھی زیادہ محکموں کا سربراہ مقرر کر دیا گیا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ ان محکموں میں مرکزی سراغرسانی کا محکمہ بھی شامل ہے۔ دُرگا پرشاد کی ذہانت مسلم لیکن اس انقلاب میں ان کی ذہانت کا نہیں، ان کی قسمت کا دخل ہے۔ وہ جب تک روس میں رہے، بے چین اور مضطرب رہے۔ انہیں جب بھی موقعہ ملتا، وہ ماسکو سے بھاگ آتے، وہاں کی ٹھنڈی ہوائیں ان کی روح اور طبیعت دونوں کو ہی راس نہ آئیں۔ اور وہ کافی عرصے سے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، انہیں اس بات کا شدید احساس تھا، کہ انہیں روس کا سفیر بنا کر دراصل جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اُن کی اِس نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے تین سال قبل اسی صفحے پر لکھا تھا۔

''روس میں ہندوستانی سفیر کا عہدہ کسی بھی ڈپلومیٹ کیلئے باعثِ افتخار ہوسکتا ہے، لیکن درگا پرشاد در کیلئے یہ اعزاز قید بامشقت سے کم نہیں، ریاستی سیاست کے جنگل میں چوکڑیاں بھرنے والا یہ ہرن اب ماسکو کے چڑیا گھر میں نمائش کیلئے رکھا جا رہا ہے۔ اس پنجرے میں دنیا بھر کی آسائشیں اور لذتیں مہیا ہونگی، لیکن وہ وسعتیں کہاں سے آئیں گی کہ جنہوں نے دُرگا پرشاد در کو ڈی، پی، بنا دیا تھا۔''

روس میں در صاحب کی سفارت کے تین سال سیاسی فتوحات کے اعتبار سے زیادہ اہم نہیں ہیں اور اس میں در صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ روسیوں کی ڈپلومیسی اور دوستی برف کی طرح ٹھنڈی اور مشین کی طرح بے روح ہوتی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے۔اس پراچھی انگریزی، عمدہ شراب اور خوبصورت جملوں کا اثر نہیں ہوتا۔اور یہی وجہ ہے کہ دُرگا پرشاد ماسکو کے سفارتی حلقوں میں بہت مقبول ہونے کے باوجود روسی حکومت کو ہندوستان اور پاکستان کے تیئں اپنا رویہ بدلنے کی ضرورت اور معقولیت کا احساس دلانے میں ناکام رہے۔ پچھلے تین سال کے دوران روس نے پاکستان کو سب سے زیادہ اسلحہ دیا۔اور پاکستان روس کے اتنے قریب آ گیا، کہ پہلے کبھی نہ تھا۔ بعض لوگ فرطِ محبت اور جوشِ عقیدت سے ہندوستان دوستی کے حالیہ معاہدے کو دُرگا پرشاد در کی فتوحات میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں، کہ اِس معاہدے کا زیادہ کریڈٹ امریکہ کے صدر نکسن کو ملنا چاہیے، کہ جن کی دیوانگی نے روس اور ہندوستان دونوں کو اِس قسم کا معاہدہ کرنے کیلئے مجبور کر دیا۔روس اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی خوشگواری نظریاتی ہم آہنگی کے علاوہ بعض سیاسی حالات، مجبوریوں اور حادثات کی پیداوار ہے۔اور جو لوگ اس کا سہرا دُرگا پرشاد ذر کے سر رکھنا چاہتے ہیں۔وہ افسانے اور حقیقت کو غلط ملط کرتے ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تاریخ کے اِس مرحلے پر در صاحب ماسکو میں ہمارے سفیر تھے۔ان کی جگہ مفتی محمد سعید، غلام نبی آزاد سوگامی یا پیر غیاث الدین بھی ہوتے، تو ماسکو اور نئی دِلی کے درمیان تعلقات کی نوعیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔اسی طرح در صاحب اگر ماسکو کی بجائے اس وقت واشنگٹن میں ہمارے سفیر ہوتے، تو امریکہ کا رویہ ہمارے تیئں مختلف نہ ہوتا۔امریکہ اور روس جیسے ممالک کی پالسیاں اپنے ملکی مفادات اور عالمی سیاست کے تقاضوں کے تابع ہوتی ہیں۔اور انہیں کوئی سفیر اپنی چرب زبانی، خوش اخلاقی یا اداکاری سے بدل

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نہیں سکتا۔

معاف کیجئے، کہ چراغ بیگ کے اس استدلال سے کہیں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ وہ دُرگا پرشاد در کی ذہانت، فطانت، دوراندیشی اور دوسروں کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیتوں کا قایئل نہیں۔ اس کے برعکس وہ در صاحب کی سیاسی سوجھ بوجھ۔۔۔۔۔ اور بالغ نظری کا مداح ہے۔ اور تین سال تک قیدِ بامشقت کاٹنے کے بعد وہ آج جس طرح ہندوستانی سیاست کے افق پر چھا گئے ہیں۔ اسکے پیش نظر اب ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور غیر معمولی اہلیتوں پر ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ چراغ بیگ اس وقت ایمان لائے تھے۔ کہ جب دُرگا پرشاد در کو کشمیر کی سیاسی رزم گاہ سے بہت بے آبرو ہو کر نکال دیا گیا تھا۔ ان کے زوال کی کہانی رقم کرتے ہوئے میں نے آج سے تین سال قبل لکھا تھا!

''ڈی، پی در جادوگر ہے، وہ جس سے دوستی کا دم بھرتا ہے، اسے کچھ اس طرح اپنے شیشے میں اُتارتا ہے۔ کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کی اکثر دوستیاں مصلحتوں اور ضرورتوں کے تابع ہوا کرتی ہیں۔ وہ بے حد ذہین، بے پناہ چالاک اور بے مثال Conversationalist ہے اور اِس لحاظ سے اس میں ایک سفیر کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اسے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے اور اس نے اپنی خوش کلامی سے بڑے بڑے معرکے سر کیئے ہیں۔ ڈی، پی نے یہ بات ثابت کر دی ہے، کہ مخصوص معاشرے میں ایک انسان کس طرح اپنی غیر معمولی ذہانت اور فطانت کے سہارے اقتدارِ اعلیٰ کے ایوانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ بلکہ اپنے سے طاقتور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

حریفوں کو نیچا بھی دکھا سکتا ہے۔"

آج تین سال بعد درصاحب نے ایک اور کرتب دکھا کر میرا تجزیہ صحیح ثابت کردیا ہے۔ خواجہ غلام محمد صادق نے انہیں بزعمِ خود کشمیر کے سیاسی میدان سے کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا اور سید میر قاسم نے انہیں حالیہ پارلیمانی انتخاب میں بارہ مولہ کی انتخابی نشست کیلئے ٹکٹ دینے سے انکار کر کے دھتکار دیا تھا۔ لیکن دُرگا پرشاد در ہار کے بھی نہیں ہارے۔ اور آج وہ ایک ایسی جگہ پر بیٹھے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ کہ جہاں سے وہ خواجہ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم دونوں کے مقدر کا فیصلہ کریں گے! صادق صاحب نے اپنی راہ کے جس پتھر کو اُٹھا کر پھینک دیا تھا۔ مِسز اندرا گاندھی نے اسے اُٹھا کر اپنی انگوٹھی میں سجا دیا ہے۔ یہ دُرگا پرشاد در کی قسمت اور کشمیر کی سیاست کا ایک دلچسپ تضاد ہے! یہاں جو سیاستدان سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور غیر معتبر قرار دیا جاتا ہے، اسے دِلی کے ایوانوں میں سب سے اونچی نشست ملتی ہے۔ اور پھر اگر اس کا نام دُرگا پرشاد در ہو، تو اسے سارے خزانوں کی کنجیاں سونپ دی جاتی ہیں۔

دُرگا پرشاد در ایک شخص نہیں، ایک پورا ادارہ ہیں۔ ایک فرد نہیں، ایک علامت ہیں۔ وہ ایک رجحان، ایک رویت، ایک تضاد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ان کے عروج میں ان کی ذہانت اور اہلیت ہی کا نہیں، ان کے جغرافیے کا بھی دخل ہے۔ وہ اس ریاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہ جہاں قوم پرست سے قوم پرست مسلمان کی نیت پر بھی شک کیا جاتا ہے۔ جہاں شیخ محمد عبداللہ، غلام محمد صادق، سید میر قاسم، حتیٰ کہ بخشی غلام محمد پر بھی مکمل اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

محکمہ سراغرسانی کا ادنیٰ سا ادنیٰ آفیسر کشمیر کے سب سے بڑے لیڈر کے متعلق فتویٰ صادر کر سکتا ہے۔ اور جہاں کا وزیر اعلیٰ بھی محکمہ سراغرسانی کی کتابوں میں ''مشکوک'' اور ''نا قابلِ اعتبار'' ہے۔ اس آب و ہوا میں دُرگا پرشاد در جیسے ذہین، فطین اور سمجھ دار آدمی نہ صرف نشو و نما پاتے ہیں، بلکہ اپنے سے زیادہ بلند قامت اور بلند مرتبہ شخصیات کی نشو نما روک بھی دیتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ محکمۂ سراغرسانی کے سابق ڈائریکٹر مسٹر بی، این ملک نے اپنی تازہ کتاب ''نہرو کے ساتھ میرے سال'' میں دُرگا پرشاد در کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے ہیں۔ یہ بھی محض ایک حادثہ نہیں ہے کہ بی، ایم کول نے اپنی تازہ کتاب میں فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک ہی آدمی قابلِ اعتبار ہے اور اس کا نام ڈی، پی در ہے۔ مسٹر کول نے تجویز پیش کی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کو ڈی، پی در صاحب کی تحویل میں دے کر باقی سب سیاستدانوں کی چھٹی کر دینی چاہیئے۔ ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کے دوسرے دِن سے ہی مرکزی حکومت نے درگا پرشاد در کو کشمیر میں اپنا ریذیڈنٹ مقرر کر دیا تھا۔ اور ابھی چند دن پہلے اخبارات میں اُن کے ریاست کا وزیر اعلیٰ مقرر کئے جانے کی جو خبریں شائع ہوئی تھیں، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مرکزی حکومت کی نگاہوں میں درگا پرشاد در کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ مجھے در صاحب کی ذہانت اور سوجھ بوجھ پر بے پناہ وشواس ہے اور مجھے یقین ہے کہ در صاحب کشمیر کا وزیر اعلیٰ بننے کیلئے کبھی تیار نہیں ہونگے۔ لیکن اِس احساس سے ان کی انا کو بڑی آسودگی مل رہی ہوگی کہ جس کشمیر سے انہیں بہت بے آبرو ہو کر نکال

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دیا گیا تھا، آج کچھ لوگ سنجیدگی سے انہیں اسکا مقدر سوچنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور مسز اندرا گاندھی نے اپنے لطف و کرم کی بارش سے انہیں اتنا ممتاز بنا دیا ہے، کہ ضعیف الاعتقاد اور ابن الوقت لوگ ان کے ساتھ بڑے بڑے معجزے منسوب کرنے لگے ہیں۔ سرینگر میں تو دُرگا پرشاد در دیکھتے ہی دیکھتے ایک افسانوی کردار بن گئے ہیں اور آئے دن ان کے بارے میں طرح طرح کی خبریں اڑتی رہتی ہیں۔ خود چراغ بیگ بھی در صاحب کی ''کرامتوں'' سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور اسی لئے آج ان کے ''زوال وعروج'' کی کہانی رقم ہو رہی ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ان کے عروجِ نو کی حکایت لکھتے ہوئے چراغ بیگ بار بار اپنے تین سالہ پرانے خاکے سے استفادہ کر رہا ہے، کہ جو در صاحب کے زوال کے وقت لکھا گیا تھا۔ اور جس میں ان کی شخصیت اور کردار کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ آج جب در صاحب آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے ہیں اور کچھ لوگ ان کے ماضی، ان کی شخصیت اور ان کے کردار کے متعلق تفصیلات جاننے کے خواہشمند ہیں۔

میں اس خاکے سے کچھ رنگ چُرا کر درگا پرشاد در کی شبیہہ بنانے کی کوشش کرونگا۔ ''کشمیر کے ایک جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود ڈی، پی کا شمار کشمیر کے اُن ''ترقی پسند'' نوجوانوں میں ہوتا ہے کہ جو ۱۹۴۵ء میں انقلاب کی تلاش میں تحریکِ آزادی سے وابستہ ہوگئے اور صرف دو برس کی جدوجہد کے بعد انقلاب کی برکتوں سے کچھ اسطرح فیضیاب ہونے لگے، کہ جوں جوں انقلاب کا دم گھٹنے لگا، یہ لوگ بلندیوں کی طرف پرواز کرنے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

لگے۔ آج اکیس برس بعد جب ڈی، پی پیچھے کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو انہیں معلوم ہوگا، کہ وہ انقلاب کو بہت پیچھے چھوڑ کر خود بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہ درگا پرشاد کی قسمت اور ڈی، پی کی بے پناہ ذہانت کا کرشمہ ہے۔"

"ڈی پی صاحب کی زندگی ایک دلچسپ داستان بھی ہے اور ایک عبرتناک افسانہ بھی۔ ان کی شخصیت کی رعنائی اور ان کے کردار کی رنگینی نے انہیں کشمیر کا سب سے بااثر اور بارسوخ سیاسی ادارہ بنا دیا تھا، حالانکہ زندگی بھر انہیں کسی سیاسی نظریئے، اعتقاد یا فلسفے پر اعتماد نہیں رہا۔ وہ سیاسی میدان میں تنہا آئے اور آج بیس برس بعد تنہا جا رہے ہیں۔ اُنہوں نے کبھی عوامی مقبولیت یا عوامی اساس کی پرواہ نہیں کی، اور کشمیر کے مخصوص سیاسی حالات میں ان کا رویہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔"

"وہ اپنے حریف کو نیچا دکھانے کیلئے "محبت اور جنگ میں سب جائیز ہے" کے اصول پر بڑی سختی سے کاربند ہیں۔ اسلئے ضرورت پڑنے پر اپنے بدترین دشمن کو بھی سینے سے لگاتے ہیں۔ اور اپنے بہترین دوستوں کو تختہ دار پر لٹکانے سے نہیں ہچکچاتے۔ جہاں ان کی گرم گفتاری کام نہیں آتی۔ وہاں ان کی شیریں بیانی اپنا جادو دکھاتی ہے۔ وہ جنگ جیتنے کیلئے جان بوجھ کر لڑائیاں ہارتے ہیں۔ دشمن کو غافل پا کر پھر ایسا بھرپور وار کرتے ہیں، کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا، کہ حملہ کہاں سے ہوا ہے۔" اور آخر میں، میں نے ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی:

"ڈی، پی بے حد حاضر جواب، بہت اچھے پارلیمنٹرین اور بڑے قابل آدمی ہیں۔ افسوس صرف اس بات کا ہے، کہ ان کی ساری قابلیت اور صلاحیتیں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

حقیر مقاصد اور ذاتی مفادات کیلئے ہی وقف رہیں۔ اگر بے پناہ ذہانت اور غیر معمولی فطانت کے ساتھ انہیں دیانت اور خلوص کی دولت بھی نصیب ہوتی، تو وہ کامیاب سیاستدان ہی نہیں ایک عظیم انسان بن سکتے تھے۔"

آج حالات کی سازش، کشمیر کی تقدیر اور ڈی، پی صاحب کی قسمت نے ایک بار پھر انہیں ایک ایسے منصب پر کھڑا کر دیا ہے۔ کہ وہ کشمیر کے مستقبل، اس کی عزت اور اس کی آبرو کے تحفظ کے لئے بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ ماضی میں انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں محکمہ سراغرسانی کے افسروں کی خوشنودی اور مرکزی لیڈروں کا اعتماد حاصل کرنے میں صرف کر دی ہیں۔ اگر وہ ایک بار کشمیری عوام کا اعتماد اور اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کی پر خلوص کوشش کریں، تو ان کے سارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ انہیں روس اور ہندوستان کو قریب لانے کا تمغہ دے رہے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں چین اور ہندوستان کی دوستی کا کریڈٹ دینے کے لئے بے قرار ہیں۔ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اس دن کا منتظر رہوں گا، کہ جب وہ کشمیر اور ہندوستان کو صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے قریب لانے کیلئے پر خلوص کوششوں کا آغاز کریں گے۔ یہ کام خالی ذہانت اور جوڑ توڑ سے نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کیلئے خلوصِ نیت اور غیر معمولی ایثار کی ضرورت ہے۔ کیا ڈی۔ پی در میں یہ تاریخی فریضہ انجام دینے کی ہمت اور صلاحیت ہے؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

☆ ....

تغیر اور تبدیلی قدرت کا قانون ہے، اِس لئے چراغ بیگ کسی تغیر سے حواس باختہ نہیں ہوتا حکومت ہند کی پالسیوں میں کئی بار تبدیلیاں آئی ہیں، اور آتی رہیں گی، پالیسیوں کی کیا بات ہے خود حکومت میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ یہ پیش گوئی کرنے کے لئے سیاسی لال بجھکڑ ہونا ضروری نہیں کہ مرکز میں حکمران سیاسی جماعت میں جو رسہ کشی ہے، اِس کے نتائج جلد یا بدیر تبدیلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ البتہ ہماری ریاست میں ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہے کیوں کہ یہاں حکمران جماعت حکومت کے تابع ہے لوکل باڈیز کا جو الیکشن ہوا، اس میں حکمران جماعت نے محسوس کیا کہ حالات ایسے ہیں جن میں سرکاری افسروں کی مداخلت بے جا کے باوجود کانگریس کو ایک سیٹ بھی نہیں ملے گی پارلیمانی انتخابات میں اور ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں سرینگر میں سرکاری افسر ''دست غیب'' سے بیلٹ بکس بہت زیادہ مقدار میں کانگرس کے حق میں بیلٹوں سے نہ بھر واسکے، نتیجہ یہ ہوا کہ سرینگر سے جو ریاست کی راجدھانی ہے۔ حکمران کانگریس کا کوئی اُمیدوار کامیاب نہ ہوسکا۔ البتہ مرحوم وزیراعلیٰ جناب غلام محمد صادق کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہمشیرہ محترمہ زینب بیگم ۲۷ ووٹوں کی اکثرت سے کامیاب قرار دی گئیں۔ خدائے سخن میر تقی میر کے بہتر نشتر مشہور تھے۔ اب سرینگر میں ۷۲ نشتر ووٹ سمجھے جاتے ہیں، جن سے محترمہ زینب بیگم کامیاب ہوئیں۔

ایک سیاسی مبصّر کا کہنا ہے کہ الیکشن اگر ۱۹۷۳ء میں ہوا ہوتا تو یہ ۷۳ نشتر ہوتے۔ بات دیکھئے کہاں سے کہاں پہنچی۔ بات ہو رہی تھی تغیر اور تبدیلی کی ایک نمایاں تبدیلی ریڈیو کشمیر کی پالیسی میں بھی رُونما ہوئی ہے، ابھی تک یہ آکاش وانی ہوا کرتا تھا اب یہ اسم بامسمّٰی ہے یعنی واقعی ریڈیو کشمیر ہو گیا ہے اور اِس کے ہوتے ہوئے ریاست میں محکمہ اطلاعات، اب فضول محکمہ ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے خبروں میں ریاستی محکمے کے پریس نوٹ شامل کئے جاتے تھے لیکن اب ریڈیو کے پروگرام مقامی سیاست کا اکھاڑہ بن گئے ہیں، صبح کی ''آج کی بات'' سے لے کر نیوز بلیٹن، وادی کی آواز اور آمنے سامنے۔ سب حکومت اور وزیروں کی پبلسٹی کے لئے وقف ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ریڈیو کشمیر کے پروگراموں کے بجائے دوسرے اسٹیشن اور دودھ بھارتی کے پروگرام سننا شروع کر دئے ہیں، ریڈیو کشمیر نے شاید موجودہ حکمرانوں کے اشارے پر صادق صاحب کی شبیہ کو دُھندلا کرنے کے لئے ایک خاص پالیسی اپنائی ہے۔ ۹/ اکتوبر کو وادی کی آواز میں ایک اُستاد کا انٹرویو ہوا تھا۔ چنانچہ ان کو وادی کی آواز کے درشنی پروگرام میں طلب کیا گیا۔ اور اِس میں ایک سوال کے جواب میں، خالص مُعلّم کے لئے انداز میں سبق پڑھاتے ہوئے، موصوف نے غلام محمد صادق کا ذکر کیا اور صادق صاحب کو مرحوم کہلوانا مناسب نہیں سمجھا۔ آنجہانی صادق صاحب کہا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گیا، ریڈیو کشمیر سے اپنے حساب سے بڑے لطیف انداز میں جو دو چار لوگ پروگرام سنتے ہیں، اِن کے حساب سے بڑے مذموم اور گندے طریقے سے مرحوم وزیر اعلیٰ پر کیچڑ اُچھالی گئی۔ ریڈیو کے سب پروگرام پہلے سے ریکارڈ کئے جاتے ہیں۔ خاص طور سے وادی کی آواز کے پروگرام، اس لئے یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ مقرر کی زبان پھسل گئی۔ مقرر کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ انٹرویو میں جو جوابات دیے جا رہے ہیں وہ لکھے ہوئے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ ریڈیو کشمیر کے عملے میں تعلیم یافتہ لوگ کم ہی ہیں، لیکن یہ بات چراغ بیگ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وادی کی آواز سے وابستہ پروگرام کے کرتا دھرتا سے مرحوم اور آنجہانی کہلوایا گیا ہے۔ تا کہ جنگ بندی لائن کے پار سننے والوں کو خوش کیا جائے اور جنگ بندی لائن کے اِس طرف اِن لوگوں کو خوش کیا جائے جو صادق صاحب کی شبیہ کو اِس لئے دُھندلا کروانا چاہتے ہیں کہ اِن کے چہرے معہ اِن نقابوں کے اُبھر سکیں۔

ریڈیو کشمیر کا ایک اور پروگرام ہے۔ ''آمنے سامنے'' آدھ گھنٹے کے اِس پروگرام میں ایک وزیر کو سٹوڈیو کے تختِ طاؤس پر بیٹھایا جاتا ہے۔ اور اس کے گرد تین چار چمچے بٹھا دیئے جاتے ہیں، پہلے وزیرِ بے تدبیر اپنے سیکرٹریوں اور ڈائریکٹروں کی لکھی ہوئی تقریر پڑھتے ہیں جس میں دُودھ شہد کی نہریں جاری ہونے کا مژدہ سُنایا جاتا ہے۔ پھر چمچے ان سے ایسے سوال کرتے ہیں جن کے جواب میں وزیرِ بے تدبیر مزید پبلسٹی کے لئے قلابے مِلاتے ہیں۔ چراغ بیگ اِس سلسلے کا چوتھا پروگرام منگل کی شام کو سُن کر لکھ رہا ہے، اِس لئے اِس پروگرام کا جائزہ لینا زیادہ دلچسپ ہوگا، یہ پروگرام زراعت کے بارے میں تھا اور اِس

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں زراعت کے قلمدان کے بِلا شرکت غیرے، مالک، پنڈت تریلوچن دت ہیرد کے فرائض انجام سے رہے تھے۔ لیکن ہیرد کے فرائض اُنہوں نے کچھ اِس نہج سے انجام دیئے کہ وِلن نظر آنے لگے۔

کشمیر میں زراعت کی ترقی کا راستہ پنڈت تریلوچن دت نے یہ بتایا کہ کھیتی باڑی میں زیادہ سے زیادہ مشینوں کا اِستعمال کیا جائے'' درست بالکل درست'' لیکن نہ پنڈت تریلوچن دت نے بتایا اور نہ کِسی نے اِن سے سوال کیا۔ کہ حضور آپ زراعت کے مائی باپ ہیں یہ تو بتلایئے کہ ٹریکٹر اور بُل ڈوزر وغیرہ کون سپلائی کرتا ہے اور کِن قیمتوں پر وزیر موصوف اِس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور ان سے یہ نازک سوال کیا جا سکتا تھا'' ہوسکتا ہے سوال کیا گیا ہو اور ایڈٹ کر دیا گیا ہو' چراغ بیگ سے پوری داستان سنئیے کہ وزیر زراعت میکانائزیشن کی پبلسٹی کیوں کر رہے تھے؟ موصوف ریڈیو کشمیر سے حکومت کی پالیسی کی وضاحت نہیں کر رہے تھے، بلکہ اُس فرم کی پبلسٹی کر رہے تھے۔ جس سے موصوف کے صاحبزادے وابستہ ہیں۔ چراغ بیگ بہت گستاخ اور بے ادب ہے' اِس نے آیئنہ کے قاریئن کے لئے کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ ریاستی سرکار کو جو مشین چھ سات ہزار میں ایک فرم نے سپلائی کرنے کی پیش کش کی تھی۔ وہ مشین اِس فرم سے نہیں خریدی گئی وہ مشین محکمہ زراعت سے، وزیرِ زراعت کی منظوری (بلکہ حکم سے) اِس فرم سے خریدی جس سے وزیر موصوف کے فرزندار جمند وابستہ ہیں، اور اِن مشینوں کی قیمت بارہ ساڑھے بارہ ہزار روپے فی عدد دِی گئی۔ آکاش وانی کے مختلف، اسٹیشنوں سے ایک کمرشل سروس ہوتی ہے۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سری نگر میں یہ سروس نہیں ہوتی ہے۔ لیکن 'آمنے سامنے' پروگرام نے پنڈت تریلوچن دت کے صاحبزادے کے بزنس مفادات کے لئے آدھے گھنٹے کی پبلسٹی کی۔

آکاش وانی کی کمرشل سروس میں اشتہارات کے نرخ اخباروں سے زیادہ ہیں۔ نصف منٹ اور ایک منٹ کے لئے ہزاروں روپے دینا پڑتے ہیں، یہاں آدھے گھنٹے کی پبلسٹی شائد مفت ہوگئی۔

اِس پروگرام میں ایک سوال جو کسی نے نہیں پُوچھا' وہ چراغ بیگ پوچھتا ہے، اور ریڈیو کشمیر سری نگر سے مطالبہ کرتا ہے کی پنڈت تریلوچن دت سے اِس کا جواب نشر کروائے۔ سوال یہ ہے حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈاج ٹرکیں ریاست کی سڑکوں کے لئے مناسِب نہیں ہیں، اِس لئے یہ نہیں خریدی جائیں گی۔ لیکن تریلوچن دت صاحب نے زراعت کا قلمدان سنبھالا تو کوئی بارہ ٹرکیں محکمہ زراعت نے خرید لیں کیوں؟ نہ پنڈت تریلوچن دت ناخوشگوار سوال کا جواب دینا چاہیں گے۔ اور نہ ریڈیو کشمیر یہ جواب نشر کرے گا۔ اِس لئے چراغ بیگ سے اِس کا جواب سنئے وہ فرم جو ڈاج ٹرکیں سپلائی کرتی ہے، اِس سے پنڈت تریلوچن دت کے فرزند ارجمند وابستہ ہیں۔ اِس پروگرام میں ایک لطیفہ اور بھی ہوا۔ ایک نوجوان کاشتکار نے کہا کہ کشمیر میں لوگ مشروم پیدا کرتے ہیں پہلے ان کی قیمت زیادہ تھی لیکن اب پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے اِس کی قیمت بہت گر گئی ہے۔ حالانکہ ملک کے دوسرے حصّوں میں اِس کی قیمت اب بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر حکومت اِس کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ڈبوں میں بند کرنے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کی سہولت فراہم کرے اور فروخت میں مدد دے تو اس سے مشن مشروم اُگانے والوں کو فائدہ ہوگا۔ وزیر زراعت نے جواب دیا کہ حکومت پرائیویٹ انٹر پرائز کو بڑھاوا دینا چاہتی ہے۔

چُراغ بیگ چاہے گا کہ وزیرِ اعلیٰ سید میر قاسم اور وزیرِ اعظم شریمتی اِندرا گاندھی اپنے نظریات میں ضروری ترمیمیں کریں۔ کیوں کہ یہ دونوں سوشلزم کی بات کرتے ہیں۔ اور سوشلزم کے معنی ہیں، ذرائعِ پیداوار کا قومی ملکیت میں ہونا یہاں مشروم اُگانے والے چاہتے ہیں کہ حکومت ان کا کاروبار ہاتھ میں لے، اور وزیرِ زراعت ٹکا سا جواب دیتے ہیں اور یہ جواب ریڈیو کشمیر سے نشر ہوتا ہے۔ ریڈیو کشمیر کے پروگراموں کا معیار پہلے بھی بہت اچھا نہ تھا لیکن چُراغ بیگ کا مشاہدہ یہ ہے کہ جس قدر ہماری سرکار کا وقار گرتا جارہا ہے اور اِس کی وقعت کم ہوتی جارہی ہے۔ اُسی حساب سے ریڈیو کشمیر کے پروگراموں کا وقار اور وقعت بھی کم ہوتی رہی ہے۔ لیلیٰ اور سگِ لیلیٰ کی مناسبت سے بات کیجیے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ریڈیو کشمیر اب حکومت کا ایک ایسا خارش زدہ کُتا بن کے رہ گیا ہے جس کی خارش کی شدت روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سیف الدین قاری کے نام

محترم قاری صاحب!

پچھلے ہفتے جب میں وزیراعلیٰ سید میر قاسم کو ان کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب پر مبارکباد دے کر لوٹ رہا تھا، تو آپ بغل میں رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا کوئی ... خوبصورت سا تحفہ لے کر وزیراعلیٰ کی رہائش گاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ اس موقعے پر بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آ گیا

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے!

وزیراعلیٰ سید میر قاسم سے جماعتِ اسلامی کی اُنسیت کا اندازہ ہمیں اسی وقت ہوا تھا کہ جب ریاستی اسمبلی کے لئے حالیہ انتخابات میں جماعت نے قاسم صاحب کے حلقہ انتخاب ڈوروشاہ آباد سے اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کر کے انہیں بلا مقابلہ کامیاب ہونے کی عزت بخشی تھی، اس کے بعد انتخابی مہم کے دوران قاسم صاحب نے جماعت اسلامی کو جس آزادی سے مذہب اور مسجدیں استعمال کرنے کی اجازت دی تھی، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ قاسم

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

صاحب جماعت کے ''احسان'' کا بدلہ چکا رہے ہیں۔ اسمبلی کی پانچ نشستوں پر جماعتِ اسلامی کے اُمیدواروں کی کامیابی، اور آپ کی فوری رہائی نے آپ کو اس درجے مسحور کر دیا، آپ نے اسلام، اخلاق، انصاف اور عزت نفس کے سبھی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو ''پہلی بار'' ریاست میں آزادانہ انتخابات منعقد کرانے کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا۔ آپ بھول گئے، کہ ان انتخابات سے پہلے سینکڑوں نہیں، لاکھوں لوگوں کو انتخابات میں اُمیدواری کے نااہل قرار دیا گیا تھا۔ آپ بھول گئے کہ انتخابات کے لئے گورنر کا نوٹیفکیشن جاری ہونے کے دو دن بعد بیگم شیخ محمد عبداللہ کے ریاست میں داخل ہونے پر پابندی عائد کر کے مولانا محمد سید مسعودی، غلام محی الدین قرہ اور سینکڑوں دوسرے سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا، آپ بھول گئے، کہ اُمیدواروں کے لئے کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال کے دن درجنوں اُمیدواروں کے کاغذات صرف اس لئے نامنظور کر دیئے گئے کہ ان کے ہوتے ہوئے سرکاری اُمیدواروں کی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ آپ بھول گئے، کہ انتخابات کے دوران سرکاری اُمیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے ظلم و تشدد، بے ایمانیوں اور بدعنوانیوں کے نئے ریکارڈ قایم کئے گئے۔

آپ یہ بھی بُھول گئے، کہ ان انتخابات کے دوران شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے ریاست میں داخل ہونے پر عائد شدہ پابندی بدستور قائم تھی، اور محاذ رائے شماری کے سینکڑوں کارکن نظر بند تھے، آپ یہ سب کچھ بھول گئے۔ اور اگر آپ کو کوئی بات یاد رہ گئی، تو وہ یہ ہے کہ آپ، اور آپ کی جماعت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے چار اُمیدوار" کامیاب" ہو گئے۔ آپ کو شاید اس بات کا اندازہ نہ ہو، کہ اسمبلی کے انتخابات میں پانچ نشستوں کی خیرات دے کر قاسم صاحب نے کس طرح آپ کو بے دام خرید لیا ہے۔ ان کے لئے یہ سودا واقعی بہت سستا ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ انتخابات کے آزادانہ ہونے کا جو سرٹیفکیٹ وہ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے بھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ وہ آپ نے انہیں مفت بخش دیا۔ چالیس برس قبل اقبال نے ایک ایسے ہی موقعے پر یہ شعر کہا تھا۔

مُلا کو ملی ھند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ ہے ھند اب آزاد

قاری صاحب! آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے عطا کردہ سرٹیفکیٹ کو وزیر اعلیٰ سید قاسم کے علاوہ مرکزی وزارتِ داخلہ میں وزیرِ مملکت کے' سی پنت نے بھی استعمال کیا۔ پارلیمنٹ کی مشاورتی کمیٹی میں جب کچھ ممبروں نے کشمیر میں انتخابات کے نام پر فراڈ کا ذکر کیا تو شری پنت نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ "جماعتِ اسلامی کے سرکردہ رہنما سیف الدین قاری نے بھی انتخابات کو آزادانہ قرار دیا ہے" چو کفر از بر خیزد کجاند مسلمانی! سید میر قاسم کی محبت میں' آپ اور آپ کی جماعت اِس بے دردی سے حق و صداقت کا خون کر دیں گے، یہ چراغ بیگ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا!۔ اسمبلی میں داخل ہونے کی ہوس آپ کو انصاف اور اخلاق کے ہر تقاضے سے بے نیاز کر گئی۔ یہ آپ کے مخالفوں کے وہم وگمان میں نہ تھا۔ صرف اڑھائی سال قبل آپ نے سٹیٹ پیپلز کنونشن میں "سیکولرازم" کے لفظ پر اپنی برہمی اور ناراضگی کا اظہار کر کے کنونشن سے واک

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آوٹ کیا تھا۔ لیکن اسمبلی کی ممبری نے نہ صرف آپ کی جماعت کو سیکولر بنا دیا بلکہ آئین ہند پر ایمان لانے کے لئے بھی آمادہ کر دیا۔ دُنیا میں صِرف خدا کے قانون اور آئین پر ایمان رکھنے والوں نے اسمبلی کی ممبری کے لئے سیکولر آئین سے وفاداری کا حلف اُٹھا لیا۔ چراغ بیگ ہی کی طرح بہت سے حق گو اور حق شناس، آپ کی اس مصلحت آمیز، ترقی پسندی کا پسِ منظر اور جواز جاننے کے لئے بے چین ہیں؟ اور ہاں لگے ہاتھوں یہ بھی بتایئے کہ سید میر قاسم کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لئے آپ کتنے عرصے تک حق و صداقت سے آنکھیں چُراتے رہیں گے۔

فقط آپ کا مخلص

چُراغ بیگ

......☆......

(۷ر جون ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جے پرکاش نرائن کے نام!

سُنا ہے کہ مدھیہ پردیش میں بڑے بڑے ڈاکوؤں سے ہتھیار چھین کر اب آپ مغربی بنگال میں ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات کے دوران مبینہ۔۔۔ دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کی غیر سرکاری تحقیقات کرنے کے لئے کلکتہ جارہے ہیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ آپ کے اِس فیصلے سے مرکزی سرکار اور مغربی بنگال کی حکومت' دونوں ہی سخت برہم ہیں۔ انہیں بجا طور پر یہ اندیشہ ہے کہ آپ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات سے مکروفریب، ظلم وتشدد، بے حیائی اور بدچلنی کے ان تمام واقعات سے پردہ اُٹھ جائے گا۔ کہ جن کے بَل بوتے پر کانگریس نے بیک وقت اپنی کامیابی اور رسوائی کا سامان بہم کیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی کے پھیلائے ہوئے اندھیرے میں، آپ کا مہاتما گاندھی کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھنے کی کوشش کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور چراغ بیگ اِس جرأت اور حوصلہ مندی کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو مُبارکبادی کیساتھ ہی حرف شکایت بھی زبان پر لاؤں۔

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے!

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ملک میں اب تک پانچ بار عام انتخابات ہوئے ہیں، لیکن مغربی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسٹ) نے پہلی بار انتخابات میں زیادتیوں اور دھاندلیوں کی شکایت کی ہے، اِس کے برعکس اسی ملک کی ایک اور ریاست ـ جموں و کشمیر ـ میں پچھلے بیس برسوں میں پنچایت سے لے کر پارلیمنٹ تک کے لئے جتنے بھی ـ ـ ـ انتخابات ہوئے ہیں ـ ان میں بے ایمانی، بدکرداری اور بدچلنی، چوری اور سینہ زوری، غنڈہ گردی اور دہشت زدگی، بربریت اور بہیمیت کے نت نئے ریکارڈ قائم کئے گئے ہیں ـ اِسی بدقسمت ریاست میں اُمیدواروں کو اغوا اور تجویز کنندوں کو چُرانے کی رسم کا آغاز ہوا ـ اور اسی سرزمین پر ووٹروں کے ہاتھوں سے ووٹوں کی پرچیاں چھین کر انہیں سرکاری اُمیدواروں کے حق میں ڈالنے کا طریقہ بھی رائج کیا گیا ـ پچھلے بیس برسوں میں ووٹ چوری اور بے ایمانی کا شاید ہی کوئی نسخہ ہو جو آزمایا نہ گیا ہو ـ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں موجودہ وزیراعلیٰ سید میر قاسم کی ''جمہوری'' قیادت اور خواجہ غلام محمد صادق کی ''ترقی پسند'' وزارت میں اُمیدوار یا تجویز کنندہ نہیں، بلکہ کاغذاتِ نامزدگی میں سے مخالف اُمیدواروں کے حلف نامے چُرانے کی طرح ڈالی گئی ـ ۱۹۷۱ء میں اپنے مخالفوں کو ریاست بدر کرنے کا نیا تجربہ شروع کیا گیا ـ جسے ۱۹۷۲ء میں باقاعدہ قانون کا درجہ حاصل ہوا ـ تفصیلات بیان کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ موقع ومحل، صرف یہ یاد دِلانا کافی ہے ـ کہ کشمیر میں پچھلے بیس بائیس برسوں میں اتنی بار قبائے جمہُوریت تار تار ہوئی ہے کہ ہندوستانی ـ ـ جمہُوریت کا کھوکھلا اور گھناؤنا وجود اب بالکل عریاں نظر آتا ہے ـ آپ نے خود کئی بار اس لفنگ بازی،

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

غنڈہ گردی اور آمریت کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اِسے ہندوستانی جمہوریت کی پیشانی پر ایک کلنک قرار دیا ہے۔ اب یہ کلنک، ملک کی عوامی زندگی کا ناسور بن گیا ہے اور اس سے بہتی ہوئی پیپ نے مغربی بنگال، بہار اور ملک کے دوسرے حصّوں کو بھی اپنی زد میں لینا شروع کیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے آپ کو تشویش لاحق ہو رہی ہے۔ اور آپ غیر سرکاری طور پر مغربی بنگال میں انتخابات کے نام پر غنڈہ گردی اور دہشت زدگی کے الزامات کی تحقیقات کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

جے پرکاش جی! کیا یہ جاننے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ کہ پچھلے بیس بائیس برسوں میں، آپ نے کشمیر میں انتخابات میں دھاندلیوں کے الزمات کی تحقیقات کرنے میں تغافل کیوں برتا؟۔ آپ ایک بار غیر سرکاری سطح پر تحقیقات کر کشمیری عوام کے زخموں پر مرہم رکھ سکتے تھے۔ آپ صرف تحقیقات کا وعدہ ہی کرتے، تو ہمارے درَد کی شدّت کم ہو جاتی۔ مغربی بنگال میں تو یہ ظُلم پہلی بار ہوا ہے۔ ہم لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ انصاف کیا ہوتا ہے؟ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات، کِس جانور کا نام ہے؟ اگر آپ واقعی جمہوری اقدار کو مستحکم اور جمہوری اداروں کو پائیدار بنانے کے لئے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں، تو تحقیقات کا کام مغربی بنگال سے نہیں، کشمیر سے شروع ہونا چاہیئے، کیونکہ ظلم، ناانصافی، بد چلنی، بدعنوانی، بد کرداری اور بے ایمانی کا اصل منبع تو کشمیر ہے۔ مغربی بنگال میں ہونے والی زیادتیاں اور بدعنوانیاں دراصل اِسی بدمعاشی کا حصہ ہیں، کہ جس کا آغاز آج سے بیس برس پہلے کشمیر میں ہوا تھا۔ اور یقین کیجیئے کہ اگر کشمیر پر کیئے جانے والے ظلم کو نہ روکا گیا، تو مغربی بنگال ہی کیا،

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سارا ہندوستان اس کی زد میں آجائے گا۔ آج بیس برس بعد مغربی بنگال کی باری آئی ہے۔ پانچ سال بعد یو۔ پی، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور مدراس میں بھی وہی کچھ ہوگا۔ جو کشمیر میں ہوتا آیا ہے، کیا آپ مدھیہ پردیش کے ڈاکوؤں اور مغربی بنگال کے جابروں سے فرصت پانے کے بعد کشمیر کا رُخ کریں گے؟ کشمیر کے عوام آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

فقط۔۔۔آپ کا مخلص

چراغ بیگ

......☆......

(۷/جون ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

چراغ بیگ کی ڈائری

گزشتہ ایک ڈیڑھ مہینے کے دوران چراغ بیگ زیادہ تر آوارہ گردی میں ہی مصروف رہا۔ اِس لئے باقاعدگی سے اِس صفحے پر اپنے خیالات اور تاثرات پیش نہ کرسکا، اس مختصر سے عرصے میں، میں نے سرنگر سے دِلّی، بمبئی، کولکتہ اور گوا تک کا طویل سفر کیا، اور تجربات وحوادث کا بیش قیمت سرمایہ جمع کرنے کے لئے علاوہ بہت سے دلچسپ لوگوں سے بھی مِلا۔ اس سفر میں 'یادوں کی برات' کے عنوان سے میں نے جو تاثرات اپنی ڈائری میں درج کئے ہیں۔ ان کا ایک حصّہ قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

۲۷ نومبر کو جب عازمینِ حج کا پہلا سمندری قافلہ بمبئی سے جدہ کے لِئے روانہ ہوا، تو میں بمبئی میں موجود تھا، معلوم ہوا کہ کشمیری حاجیوں کی اکثریت اِسی جہاز سے سفر کر رہی ہے، اِس لئے میں انہیں الوداع کہنے کے لئے ''بلاڈ اسٹیٹ'' پہنچ گیا جہاں اکبر نام کا سمندری جہاز لنگر انداز تھا اس جہاز سے تقریباً پندرہ سو عازمین حج کا قافلہ اپنے مبارک سفر پر روانہ ہونے والا تھا، لیکن بندرگاہ کے اندر اور باہر تین چار ہزار کا ہجوم جمع تھا، اور چاروں طرف ایک

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

افراتفری کا عالم تھا، اگرچہ حج کمیٹی کی طرف سے ضروری انتظامات کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا گیا تھا، لیکن کشمیر کے بہت سے زائرین نے مجھ سے شکایت کی کہ ان کی دیکھ بھال پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، اس وقت بھی بہت سے دیہاتی اپنا پاسپورٹ ہاتھ میں لئے دربدر پھر رہے تھے، اور انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائیں؟ کشمیری عازمینِ حج کے متعلق عام شکایت یہ سننے میں آئی کہ وہ ضرورت سے زیادہ سامان اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں اور اس طرح اپنے لئے اور دوسروں کے لئے مشکلات کا باعث بنتے ہیں۔ اکثر مسافروں نے مجھ سے کہا کہ اب کی بار پٹھانکوٹ سے بمبئی تک ریل کا سفر انتہائی تکلیف دہ اور صبر آزما تھا۔ اور ٹرین دو دن کے بجائے تین دن کے بعد بمبئی پہنچی۔ اکثر لوگوں نے یہ شکایت کی، کہ اب کی بار قلیوں کو سامان اُٹھانے کے لئے ایک نہیں، تین بار پیسے دینے پڑے۔ معلوم ہوا کہ چاولوں کی چھ بوریاں جو عازمینِ حج سرینگر سے اپنے ہمراہ لائے تھے، ضبط کر دی گئی ہیں، کیوں کہ بوریوں کی تلاشی پر کچھ قابلِ اعتراض مال برآمد ہوا ہے۔ ایک دیہاتی خاتون کی جیب سے چار ہزار روپے برآمد ہوئے، جو کسٹم والوں نے ضبط کر دیئے۔ حج کمیٹی کے چیرمین جناب احمد ذکریا تشریف لائے، تو میں نے ان سے کشمیری عازمین حج کی مشکلات کا ذکر کیا۔ ان کے خیال میں ہر سال مشکلات بتدریج کم ہو رہی ہیں۔ اور وہ پچھلے سال کے تجربات سے فائدہ اُٹھا کر آئیندہ سفر کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے جہاز کا معائینہ کرنے کی دعوت دی، اور میں نے ان کے ہمراہ جہاز کے اندرون کا جائزہ لیا۔ یہ جہاز اندر سے بہت ہی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

خوبصورت اور آرام دِہ ہے۔ اور یہاں ہر قسم کی سہولیات میّسر ہیں۔ یہ ہالینڈ میں تیار ہوا ہے اور ہر قسم کے جدید ساز و سامان سے لیس ہے۔ جہاز کے باہر سے اندازہ بھی نہیں ہو سکتا، کہ اس میں اتنی ساری کائنات سمائی ہوئی ہے، فسٹ کلاس کی کیبن بے حد خوبصورت ہونے کے علاوہ حد درجہ آرام دہ بھی ہے اور جہاز کی نچلی منزل میں چھوٹے درجے میں سفر کرنے والے ہر مسافر کے لئے ایک ایک برتھ کا انتظام ہے۔ میں نے دیکھا کہ کشمیر سے آنیوالے عازمین نے اپنی نشستوں پر بھی سامان لاد رکھا تھا۔ اور کہیں تلِ دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، اپنے ہاں کے حاجیوں کی بے ترتیبی پراگندگی اور پریشانی دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا، کہ حجِ بیت اللہ پر روانہ ہونے سے پہلے عازمین کے لئے سرینگر میں کم از کم ایک ہفتے کا تربیتی کیمپ منظّم کیا جانا چاہیئے جس میں انہیں حج کی اہمیت اور فضیلت کے علاوہ، سفر کے آداب اور لوازمات سے بھی آگاہ کیا جائے، مجھے ایسا لگ رہا ہے، کہ بہت سے عازمین حج کے لئے زیارت بیت اللہ ایک ضروری رسم ہے، کہ جو کسی بھی طرح، پوری ہونا چاہیئے کچھ لوگوں کے لئے تو حج تجارت اور آمدن کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ یہ صورتِ حال برقرار رہی تو حج بیت اللہ کے تقدس، اس کی فضیلت اور اہمیت کے تذکرے ہمارے دلوں کو نہ گرما سکیں گے، اِس مقدس فریضے کو ایک مبارک فرض کی طرح انجام دینا ضروری ہے۔ ایک رسم کی طرح نہیں!

......☆......

(۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دلیپ کمار سے مُلاقات

فلمی اداکار دلیپ کمار سے میری ملاقات کئی برس پُرانی ہے، لیکن ادھر کئی سال سے اِن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب کی بار جب معلوم ہوا کہ دلیپ کمار کی بڑی بہن آپا جی بیمار ہیں تو میں مزاج پُرسی کی غرض سے پالی ہل، باندرہ میں اِن کی قیام گاہ پر گیا، وہاں کسی نے بتایا، کہ آپا جی پچھلے کئی ماہ سے اجمیر شریف میں ہیں اور زیادہ تر اپنا وقت وہیں گزارتی ہیں۔ دلیپ کمار کے متعلق دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ گھر ہی پر ہیں، اور بیراگ کے پروڈیوسر مشیر صاحب سے باتیں کر رہے ہیں، میں نے اطلاح کرائی تو فوراً باہر آگئے، بڑے تپاک سے گلے لگایا اور کہنے لگے۔

"بڑے دِنوں کے بعد مِلے ہیں، لیکن اِس دوران میں، آپ بالکل نہیں بدلے"۔

"آپ کون سے بدلے ہیں۔" میں نے جواباً عرض کیا!

اس کے بعد مجھے اور لوگوں سے متعارف کیا۔ خیال تھا کہ دس پندرہ منٹ میں فارغ ہو کر چلا آؤں گا۔ لیکن باتوں کا سِلسِلہ جو شروع ہو گیا تو پورے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دو گھنٹے تک چلتا ہی رہا۔

دلیپ بہت اچھے اداکار تو ہیں ہی بہت اچھے CONVERSATIONLIST بھی ہیں۔ ہر موضوع پر گفتگو کر سکتے ہیں، اور ان کا مطالعہ چونکہ وسیع ہے اس لئے اپنی گفتگو میں وزن اور وقار بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ اپنی دو گھنٹے کی مُلاقات میں ہم نے مذہب، سیاست اور کوآپریٹو فارمنگ پر تبادلہ خیال کیا، اور مجھے اِس بات سے طمینان ہوا کہ دلیپ، مذہب اور سیاست دونوں کے متعلق ترقی پسندانہ اور لبرل خیالات رکھتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ زبون خیالی کے متعلق مجھے دلیپ کا یہ فقرہ بہت پسند آیا کہ ''مسلمانوں کو ابھی تک اپنی زبون حالی پر آنسو بہانے سے ہی فرصت نہیں ملتی، وہ اپنی حالت بہتر بنانے کے لئے کیا کریں گے؟'' اُنہوں نے اِس بات پر افسوس کا اظہار کیا، کہ ملک میں رشوت ستانی اور بدعنوانی، زندگی کا ایک ناگزیر حصّہ بن کر رہ گئی ہے۔ مذہب کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ جو مذہب اِنسان کو زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں دیتا وہ مذہب نہیں، پاؤں کی زنجیر ہے۔

بمبئی کے فِلم سازوں اور امپیک کے چیئرمین علی محمد طارق کے درمیان پچھلے کئی ماہ سے بیان بازی اور الزام تراشی کی جنگ جاری ہے، میں نے اس سلسلے میں دلیپ کا نکتہ نظر جاننے کی کوشش کی، تو اُنہوں نے بتایا کہ میں صرف یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں، کہ طارق صاحب پر روپیہ بنانے کا الزام غلط ہے۔ پروڈیوسروں کے دوسرے الزامات کے متعلق اُنہوں نے کچھ کہنے سے اِنکار تو نہیں کیا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ خاموش رہنا ہی پسند کریں گے، وہ دراصل

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

طارق صاحب کی وکالت نہیں کرنا چاہتے تھے، اور حق بات یہ ہے کہ کوئی شریف اور مہذب آدمی طارق صاحب کی وکالت پسند نہیں کرے گا!

دلیپ کمار نے مجھے بتایا، کہ اِن کے چھوٹے بھائی اسلم سات سال کے بعد امریکہ سے لوٹے ہیں۔ اور انہیں یہ دیکھ کر قدرے تعجب ہوا کہ اِن سات برسوں میں اسکی ہندوستانیت بدستور قایئم ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ اِن سے مِل لیں لیکن وہ احسن (دلیپ کمار کے بھائی) کے ساتھ کہیں گئے ہیں۔ دلیپ نے کہا۔

"اب آپ کی بیوی کیسی ہیں؟" میں نے دریافت کیا، تو بولے کہ وہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہورہی ہیں۔ انہیں بچے کی موت کے صدمے نے نڈھال کردیا تھا!" میں نے رخصت چاہی تو دلیپ اپنی کوٹھی کے گیٹ کے باہر چھوڑنے آئے اور مجھے اپنا ذاتی ٹیلی فون نمبر دیکر اصرار کیا کہ آئیندہ میں جب بھی بمبئی آؤں انہیں ضرور اطلاع کروں، باہر گیٹ پر بہت سے نوجوان دلیپ کمار کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کئی گھنٹوں سے منتظر تھے۔ دو گھنٹے کی اِس مختصر سی ملاقات نے ایک بار پھر میرا یہ تاثّر تازہ کردیا کہ دلیپ کمار ایک عظیم اداکار ہی نہیں، ایک اچھا اور مخلص انسان بھی ہے۔ اس قحط الرجال میں میں اسے اِس سے بڑا COMPLIMENT نہیں دے سکتا!

......☆......

(۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شکیلہ بانو بھوپالی

ایک شام اُردو کی مشہور افسانہ نگار واجدہ تبسّم نے ٹیلی فون پر یہ اطلاع دی کہ رات کو کہیں شکیلہ بانو بھوپالی کا پروگرام ہے، اور وہ اپنے میاں اشفاق کے ساتھ بانو کی قوالی سننے جارہی ہیں۔ اُنہوں نے اصرار کیا کہ میں بھی چلوں، اور ساتھ ہی یہ یقین بھی دِلایا کہ پروگرام بہت دلچسپ ہوگا۔ میں نے شکیلہ بانو کی قوالی آج سے دس برس قبل، سرینگر اسٹیڈیم میں جشنِ کشمیر کے دوران سُنی تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شہر میں کئی دِن تک اِس کافرہ کا چرچا رہا تھا۔ بانو کی بے باکی اور عشوہ طرازی سے گھبرا کر بہت سے شریف بزرگ اور مولوی قسم کے لوگوں کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ لیکن سرینگر اور مضافات شہر سے آئے ہوئے تقریباً پندرہ ہزار لوگ رات بھر بانو کی قوالی اور اداکاری سے محظوظ ہوتے رہے اور دوسرے دِن ہر شخص کی زبان پر شکیلہ بانو بھوپالی کا نام تھا۔

عورت کے بارے میں دیکھا اور سنا یہ ہے کہ وہ مرد کے مقابلے میں جلدی بوڑھی نظر آنے لگتی ہے لیکن دس برس کے بعد شکیلہ بانو بھوپالی کو دیکھ کر یہ دیکھی سُنی بات بھی غلط ثابت ہونے لگی۔ بانو کے چہرے پر وہی تازگی، شادابی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اور بھولا پن نظر آیا، جس نے دس سال قبل نوجوانوں کے دِلوں میں ہل چل مچادی تھی۔ یہ میک اَپ کا اعجاز تھا یا میرا فریب نظر، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میں نے محسوس کیا، کہ دس برس بعد شکیلہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور جوان نظر آتی ہیں۔ ہم اِس خیال سے گئے تھے، کہ کچھ دیر قوالی سُننے کے بعد لوٹ آئیں گے۔ لیکن پُروگرام شروع ہوتے ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا، کہ یہاں سے اُٹھ کر جانا آسان کام نہیں۔ شکیلہ کی قوالی سننے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اپنی اداؤں اور اداکاری سے ایک ایسا سماں باندھ دیتی ہے کہ مجھ جیسے کمزور دلوں کو کلیجہ تھام کر بیٹھنا پڑتا ہے، اِس کی آواز میں کوئی خاص بات نہیں اور کم از کم مجھے اِس میں کسی ترنم یا تاثیر کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن وہ جس قیامت خیز لہجے میں شعر پڑھتی ہے، اِس سے ہر سامع شعر کی خوبصورتی اور معنویت سے محظوظ ہو جاتا ہے اور پھر اس سونے پر شکیلہ کی اداکاری کا سہاگہ۔ بس ایک قیامت بپا ہو جاتی ہے، اور حاضرین کی زبان سے بے اعتبار تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔
شکیلہ بانو کی قوالی، قوالی کے کلاسیکی معیاروں پر پوری اُترتی ہے یا نہیں، میں وثوق کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتا، میرا خیال ہے کہ شکیلہ کی قوالی اِس کی اپنی ایجاد ہے۔ اس کی قوالی بیکوقت شاعری، موسیقی، اداکاری اور عشوہ طرازی کا مجموعہ ہے اور اس میں قوالی سے زیادہ قوال کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ شکیلہ کا مقصد ENTERTAIN کرنا ہے۔ اور وہ اِس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں وہ بے حد حاضر جواب اور فقرے باز عورت ہے۔ اور اِس کے وار سے کوئی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ مجمعے میں سے کوئی اس پر فقرہ کسے، تو برجستہ ایسا جواب دیتی ہیں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کہ ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ اور فقرے باز اپنی حماقت پر کف افسوس ملتا رہتا ہے۔ میں نے کم از کم اپنی زندگی میں ایسی تیز طرار، شوخ اور حاضر جواب عورت نہیں دیکھی۔ کہ جو دس پندرہ پندرہ ہزار کے مجمع کو ایک دو نہیں، چھ چھ سات سات گھنٹے اِس طرح مصروف اور مدہوش رکھے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کا نام بھی نہ لے، آج کل مشاعرے کی طرح قوالی کے اکثر سامعین بھی اُردو زبان کی خوبصورتی اور اُردو شاعری کی معنٰی سے بے بہرہ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن شکیلہ ہر شعر کے معنی اِس طرح سمجھاتی ہیں کہ جیسے کوئی اُردو کا استاد بچوں کو سبق پڑھا رہا ہو۔

شکیلہ بانو خود ایک اچھی شاعرہ ہیں اور انہیں اکثر اردو کے مشاعروں میں اپنا کلام سنانے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ ایک ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ عنقریب اپنا مجموعۂ کلام شائع کر رہی ہیں اور اُردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر اس کا پیش لفظ لکھ رہے ہیں۔ مجھے یہ جان کر قدرے تعجب ہوا کہ سٹیج پر قیامت بپا کرنے والا یہ فتنہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں بے حد سنجیدہ، متقی اور پرہیز گار ہے۔ وہ روزے، نماز کی بے حد پابند ماں باپ کی فرمانبردار بیٹی اور اپنے بھائیوں کی چہیتی بہن ہیں۔ دراصل ہر انسان کی ایک نہیں کئی شخصیتیں ہوتی ہیں۔

......☆......

(۲۳ر نومبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شکریہ! مگر شانِ نزول کیا ہے

یہ اطلاع ہر خاص و عام تک پہنچ چکی ہوگی کہ ریاستی حکومت نے مقامی صحافیوں کو مکانات تعمیر کرنے کے لئے نٹی پورہ اور صورہ میں ایک ایک کنال زمین دینے کے علاوہ اِن کے حق میں بیس بیس ہزار روپے بطور قرضہ منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے وزیرِ تعمیرات و مکانات مُفتی محمد سعید نے بہ نفس نفیس اخبار نویسوں کو حکومت کے اِس تاریخی فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے یہ اُمید ظاہر کی، کہ پلاٹوں کی تقسیم اور قرضوں کی منظوری صحافیوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے حکومت کے پنج سالہ پلان کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ ابتدائی مرحلے کے بعد جو نازُک مرحلے آتے ہیں، اِن کی وضاحت کئے بغیر "مپُتھی" سعید نے اعلان کیا کہ اخبار نویسوں کو یہ خصوصی مراعات دینے کا مقصد، صحافت اور صحافیوں کے تئیں حکومت کے جذبہ احترام کا اظہار ہے اور بس! حکومت کی اِس فیاضی اور دریا دلی پر چراغ بیگ ہی کی طرح ہر امیر اور غریب ترقی پسند اور رجعت پسند صحافی نے مپُتھی صاحب اور وزیرِ اعلیٰ قاسم صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ بچارے غریب صحافیوں کے لئے وزیرِ موصوف کا یہ ارشاد مژدہ جانفزا سے کم نہ تھا، اور وہ بہت دیر تک ان پر اپنی مسکراہٹیں نچھاور کرتے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رہے۔ اِس کمرتوڑ مہنگائی کے عالم میں، جب کہ مُردے دفن کرنے کے لئے ڈیڑھ گز زمین ملنا بھی مشکل ہے۔ زندہ صحافیوں کو مکان تعمیر کرنے کے لئے سرینگر میں ایک کنال زمین بمہ قرضہ مِل جانا، ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے کہ جس کے لئے ہمیں بیکوقت اللہ تعالیٰ اور سید میر قاسم صاحب کا شکر گزار رہنا چاہیئے۔ چراغ بیگ جس کی پیدائش ایک کرائے کے مکان میں ہوئی تھی اور جو اپنی موت کا تصور بھی ایک کرائے کے ہی مکان میں کررہا تھا نے جب اپنی بیوی کو یہ خوشخبری سنائی تو اس کو اولاً اس کا یقین نہیں آیا۔ اور جب قسمیں کھا کھا کر میں اُسے یقین دِلانے میں کامیاب ہو گیا۔ تو وہ وفورِ مسرت سے بے ہوش ہو گئیں۔ (مُپتھی صاحب کی زبان سے یہ مژدہ جانفرا سُن کر چراغ بیگ کی بھی یہی حالت ہونے والی تھی، لیکن خدا نے بچالیا) بہر کیف، اب اِس ریاست کے ہر صحافی کو اس بات کا اطمینان ہے، کہ وہ جب بھی مرے گا۔ ایک مکان چھوڑ کر مرے گا۔ اور اِسے چراغ بیگ کی طرح مالکِ مکان کے ناز نہیں اُٹھانا پڑیں گے۔ اُمید ہے کہ اپنے نئے مکانات میں منتقل ہو جانے کے بعد صحافیوں کا قلم پہلے سے زیادہ صاف گوئی اور بے باکی سے حقائق کی نقاب کشائی کرتا رہے گا!

ریاستی حکومت کی اِس مراعت سے فائدہ اُٹھانے کیلئے چراغ بیگ نے سارے لوازمات پُورے کر دیئے ہیں، درخواست، بیانِ حلفی، سٹیٹ سبجکیٹ اور آمدنی کا سٹیفکیٹ۔ اور اب اِسے اِس بات کا یقین ہے کہ مُپتھی صاحب، اِسے ایک عدد پلاٹ ضرور الاٹ کر دیں گے (اگر اُنہوں نے خدانخواستہ ایسا نہیں کیا، تو اب کی بار میری بیوی دفورِ غم سے بے ہوش ہو جائیں گی)۔ اِس یقین اور اطمینان

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے بعد چراغ بیگ کے اندر کا صحافی ریاستی حکومت سے بالعموم اور وزیر اعلیٰ سے بالخصوص یہ جاننا چاہتا ہے، کہ مقامی صحافیوں پر یہ عنایت، یہ نوازش، یہ کرم کیوں اور کِس لئے؟ اِس ریاست میں جہاں ہزاروں غریب ملازم،-- کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، سکولوں میں کام کرنے والے استاد اور چپراسی، ٹرانسپورٹ میں کام کرنے والے محنت کش ڈرائیور، اور کلینر، دس دس باراں باراں سال سے دو اور چار مرلہ زمین کے لئے ترس رہے ہیں، صحافیوں کو ایک ایک کنال زمین اور بیس بیس ہزار روپے کے قرضے کسِ خوشی میں مرحمت کئے جارہے ہیں!

اِس التفات اور کرم خاص کی تہہ میں کون سا جذبہ کام کر رہا ہے۔ اور صحافیوں کو عام شہریوں اور ضرورت مندوں پر کیوں ترجیح دِی جا رہی ہے؟ چراغ بیگ کو ایک مکان کی سخت ضرورت ہے اور کرائے کے مکانات میں رہتے رہتے اِس کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے، لیکن چراغ بیگ اکیلا اس مصیبت میں گرفتار نہیں، سینکڑوں اور ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ اِس عذاب میں مبُتلا ہیں، اِن لاکھوں مصیبت زدوں میں صرف چراغ بیگ ہی کو اس عنایت اور مراعت کیلئے کیوں منتخب کیا گیا ہے اِس کے کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں؟ کیا اِس التفاتِ خصوصی کا مقصد صحافیوں کے قلم، اِن کے ضمیر ان کی آزادی اور غیر جانبداری کی قیمت مقرر کرنا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ حکومت بڑی اُونچی آواز میں نہیں کہے گی، لیکن میں پوچھتا ہوں اور ساری دُنیا پُوچھے گی کہ پھر زمین کا یہ تحفہ اور قرضے کی یہ توپ، کسِ خوشی میں داغی جارہی ہے؟

(۱۵ر نومبر ۱۹۷۲ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

تبصرہ اور تنقید

امریکہ کے صدارتی انتخاب میں ری پبلکن پارٹی کے اُمیدوار رچرڈ نِکسن کی معرکتہ آلارا اور ضمانت ضبط کامیابی پر دُنیا بھر میں تبصرے جاری ہیں۔ چراغ بیگ کے ایک دوست نے اس پر جو ردِ عمل ظاہر کیا، وہ اپنی بلاغت، اشاریت اور معنویت کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ میرے دوست نے کہا کہ صدارتی انتخاب میں اِس بے نظیر کامیابی کی تیکنیک یقیناً رچرڈ نِکسن نے کسی کشمیری ماہر انتخاب سے سیکھی ہوگی، ورنہ پچاس کی پچاس ریاستوں کے ووٹ ایک ہی اُمیدوار کو ملنا ناممکن ہے۔ ''ہوسکتا ہے کہ صدر نِکسن نے انتخابات کی نگرانی کے لئے بھی کشمیر سے ہی ریٹرنگ افسر منگوائے ہوں۔ کیونکہ اننت ناگ کے سابق ڈپٹی کمشنر ملک عبدالخالق بہت دِنوں سے کہیں نظر نہیں آئے''۔ میرے دوست نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ رچرڈ نکسن کی کامیابی پر میرے دوست کا تبصرہ برمحل ہے یا نہیں، لیکن کشمیر کے انتخابات پر یہ سیر حاصلِ تبصرہ قابلِ داد ہے!

......☆......

(۱۵ر نومبر ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ضرورت ہے۔ دشنام طرازوں کی

وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے بالآخر اپنی کابینہ میں توسیع کے لئے کچھ "چہرے" منتخب کر لئے ہیں، اور اگر چراغ بیگ کی اطلاع صحیح ہے تو دو ایک روز میں نئے وزراء کے ناموں اور ان کی ولدیت (یعنی پورٹ فولیوز) کا اعلان کر دیا جائے گا۔ معلوم ہوا ہے کہ جن کالے چہروں کے کابینہ میں شامل کئے جانے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وزیر مملکت عبدالغنی لون نے مستعفی ہونے کی دھمکی دی تھی، اِن چہروں کو "وائٹ واش" کرنے کے بعد کابینہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اور اگر سفیدی کرنے کے بعد بھی کچھ چہروں کی سیاسی چھپ نہ سکی، تو مٹن (اننت ناگ) سے لال چہرے والے ایک لال بجھکڑ کو بھی اِس خجالت (وزارت؟) میں شامل کیا جائے گا۔ وزارت کے لئے سینکڑوں اُمیدواروں میں سے آدھا درجن وزیروں اور نائب وزیرون کا انتخاب کرتے وقت وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے اُمیدواروں کے سیاسی شعور، ان کی تعلیمی قابلیت یا ذہنی استعداد کو مد نظر رکھنے کی بجائے یہ دیکھا ہے کہ اِن میں کس نے خواجہ غلام محمد صادق (مرحوم) کو سب سے زیادہ گالیاں دِی ہیں۔ اُمیدواروں نے بھی اپنی اپنی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

عرضیوں میں خاص طور پر اسی ''کوالیفیکیشن'' پر زور دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئے چہروں کی صف میں ریاستی کانگریس کے وہ سب دشنام طراز اور لٹھ باز گور یلے نظر آئیں گے کہ جو صادق صاحب اور قاسم صاحب کی جنگ اقتدار کے دوران اپنی آبرو اور اپنا اعتبار دونوں ہی کھو چکے تھے۔ مسندِ وزارت کے سب سے بے قرار اُمیدوار غلام رسول کار نے اپنی درخواست میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ وہ صادق صاحب کو ان کی زندگی میں ہی نہیں، ان کی موت کے بعد بھی گالی دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں الیکشن لڑے بغیر ہی وزیر بنایا جانا چاہیئے۔ میر غلام محمد لسبجن نے دعویٰ کیا ہے کہ اُنہوں نے صادق صاحب کے منُہ پر تو انہیں کبھی گالی نہیں دی، لیکن پیٹھ پیچھے گالی دینے میں اُنہوں نے ایک نیا ریکاڈ قایم کیا ہے۔ انہوں نے مزید یہ دعویٰ بھی کیا ہے، کہ اِن کا سالا غلام مصطفیٰ ہر شریف آدمی کو گالی دینے کے لئے ہمیشہ کمر بستہ رہتا ہے۔ اِس لئے اسے قاسم وزارت میں ایک اہم مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ نور آباد کے عبدالعزیز زرگر نے اپنی درخواست میں اپنی گونا گوں خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنہوں نے پیدا ہونے کے فوراً بعد گالیاں بکنا شروع کر دی ہیں۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اپنے اِس دعویٰ کے ثبوت میں اُنہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ صادق صاحب کے نام اِس وقت بھی گالیاں دے رہے تھے، کہ جب وہ ان کے چیف پارلیمنٹری سیکریٹری تھے۔ سچ میں جھوٹ، اور اس اصل میں کھوٹ کی ملاوٹ ان کا آبائی پیشہ ہے۔ اس لئے وہ وزیر بننے کے لائق اور مستحق ہیں۔ مٹن (اننت ناگ) کے مکھن لال فوطیدار نے دعویٰ کیا ہے کہ میرا وجود بجائے خود ایک گالی ہے اور مجھے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اگر حکم دیا جائے تو میں صادق صاحب کی قبر پر جا کر آج بھی انہیں گالی دینے کے لئے تیار ہوں۔ اِس لئے مجھے کم از کم نائب وزیر بنا کر میری حوصلہ افزائی کی جائے۔ جموں شوسینا کے نیتا پنڈت ترلوچن دت نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر وزارت میں شرکت کے لئے صادق صاحب کو گالیاں دینے والوں کو ہی زیر غور لایا جاسکتا ہے۔ تو جموں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ جموں کے سورماؤں نے بھی مرحوم کو گالیاں دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ اُنہوں نے دبی زبان سے یہ بھی کہا ہے، کہ اگر صادق صاحب کو گالیاں ہی منصب وزارت کا معیار ہے تو قاسم صاحب کی جگہ انہیں وزیر اعلیٰ ہونا چاہیے۔ قاسم صاحب نے جموں کے دشنام طرازوں کے مفادات کو ملحوظِ خاطر رکھنے کا وعدہ کیا ہے! وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے محکمۂ سی، آئی ڈی کے ذرائع سے اُمیدواروں کی بیان کردہ ''کوالی فکیشنز'' کی تصدیق کر کے انہیں وزارت میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن وہ شائد یہ بھول گئے ہیں کہ صادق صاحب کو گالی دینے والے یہ سورما اِس سے پہلے بخشی صاحب کو، اور اُس سے پہلے شیخ محمد عبداللہ کو گالیاں دے چکے ہیں اور مناسب وقت آنے پر یہ لوگ قاسم صاحب کو بھی نہیں بخشیں گے!

......☆......

(۳۱ رمئی ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پیر صاحب کی کرامت

(شمیم احمد شمیم کے قلم سے)

میں گنڈے تعویذ اور پیری فقیری کا قایل نہیں ہوں اور جو لوگ ہیں، انہیں جاہل ہی نہیں، گناہ گار بھی سمجھتا ہوں۔ امتحان میں پاس ہونے، مقدمات میں کامیابی حاصل کرنے، دشمن پر غلبہ پانے اور بیماری سے صحت یاب ہونے کیلئے جو لوگ پیروں اور فقیروں کی ڈیوڈھیوں پر سجدہ کرتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ ضعیف الاعتقاد ہی نہیں ضعیف العقل بھی ہیں اور اس لئے قابل رحم بھی۔

میرے لیے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ امتحان کی تیاری کئے بغیر کوئی طالبِ علم کسی پیر فقیر کے تعویذ سے کس طرح کامیاب ہوسکتا ہے اور اگر قانونی اعتبار سے مقدمہ کمزور ہوتو پیر صاحب کی وکالت سے کوئی شخص یہ مقدمہ کیوں کر جیت سکتا ہے؟ لیکن سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات سے ہوتی ہے کہ کچھ نادان اور بوالہوس لوگ آج کے اس سائنسی دور میں بھی بعض خطرناک، لاعلاج اور قابل جراعت بیماروں کا علاج گنڈے تعویذ سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ہی میں سے کچھ لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ فلاں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پیر صاحب نے فلاں بیمار کو' کہ جسے سبھی ڈاکٹر لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ دو دنوں کے اندر ٹھیک کر دیا۔ میں اس قسم کے تمام دعوں کو ضیعف الاعتقاد ذہنوں کی خوش اعتقادی سے تعبیر کر کے نظر انداز کر دیتا ہوں۔ لیکن ابھی پچھلے ماہ ایک ایسا خوشگوار حادثہ رونما ہوا۔ کہ جس نے میری عقل' میرے شعور اور میری نفسیات کو چکر میں ڈال دیا ہے اور میں یہ سوچنے لگا کہ ہوں کیا میرے تمام عقل۔ مفروضات غلط ہیں؟ اس خوشگوار حادثے کی تفصیلات آپ بھی سن لیجیئے۔

میری بیوی کے چچا غلام نبی صاحب پٹن ضلع بارہمولہ کے رہنے والے ہیں۔ ٹھیکے داری کرتے ہیں اور صبح سے شام تک اپنے کام میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ میری ان سے کبھی شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا ماشاﷲ بڑے تندرست اور خوش و خرم نظر آئے۔ بے حد شریف، شرمیلے اور مخلص انسان ہیں۔ عمر چالیس اور پنتالیس سال کے درمیان ہوگی۔ اس سال جنوری یا فروری کے مہینے میں ان کے جسم کا دایاں حصہ ایک نامعلوم بیماری سے متاثر ہو کر کمزور ہونے لگا۔ اور رفتہ رفتہ کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ دائیں ٹانگ اور دایاں بازو بالکل بے حس ہو گیا۔ سرینگر میں جتنا علاج و معالجہ ممکن ہو سکتا تھا سب کر کے دیکھ لیا۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا اور ایک مہینے کے اندر وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اس مرحلے پر ڈاکٹر علی جان نے یہ مشورہ دیا کہ انہیں دہلی لیجا کر آل انڈیا میڈیکل انسٹیچوٹ میں داخل کرایا جائے تاکہ بیماری کی صحیح اور یقینی تشخیص ہو سکے، فروری کے آخری ہفتے میں بیمار کو دہلی لایا گیا۔ اور جب میں نے بیماری کا حملہ ہونے کے بعد پہلی بار انہیں دیکھا تو مجھے سخت افسوس ہوا۔ انہیں چار آدمیوں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نے ٹیکسی سے نکال کر اوپر پہنچا دیا۔ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ کھیلنے والی مسکراہٹ جیسے ہمیشہ کیلئے غائب ہوگئی ہو۔ میں نے ان کی آنکھوں میں موت کے سائے تیرتے ہوئے دیکھے، بہر کیف' وقت ضایع کئے بغیر ہم نے انسٹی چیوٹ میں ان کا داخلہ کرا لیا۔ اور داخل ہوتے ہی ان کا طبی معائنہ شروع ہوگیا۔ ہندوستان کے بہترین NEURO-SURGEON ڈاکٹر نونہال سنگھ کی قیادت میں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم نے مرض کی تشخص کیلئے درجنوں ٹیسٹ کئے۔ اور پورے پندرہ دن کے غور وفکر کے بعد ڈاکٹروں نے یہ فیصلہ کیا کہ مریض کے دماغ میں ایک پھوڑا TUMOR ہے۔ جسے نکالے بغیر مریض کا بچنا ممکن نہیں۔ دماغ کا آپریشن سنتے ہی مریض اور اس کے لواحقین دونوں ہی سخت خوفزدہ ہوگئے۔ اور میں نے انہیں اطمینان دلانے کی ناکام کوشش کی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ جب تک یہ ٹیومر (TUMOR) دماغ سے نکال نہ دیا جائے، مریض کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جائے گی۔ اور اس لئے انہوں نے آپریشن کیلئے غلام نبی صاحب ہی کا نام سرفہرست رکھا۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا کہ آپریشن کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں۔ تو اس نے بتایا کی میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ انہیں ابھی تک جو نقصان پہنچا ہے وہ ٹھیک ہوسکتا ہے یا نہیں۔ لیکن آپریشن سے اس کے پھیلاؤ کو یقینی طور روکا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹروں سے بحث ومباحثہ کے بعد میں نے قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرلیا تھا کہ مریض آپریشن کے بغیر واپس نہیں جائے گا لیکن خود مریض آپریشن کے لئے تیار نہ تھا۔ اور ایک دن اس نے آپریشن کے خوف سے ہسپتال سے بھاگ جانے کی ناکام

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کوشش بھی کی۔ وہ بے حد اُداس نظر آنے لگا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے ابھی آپریشن کے لئے حتمی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی کہ سرینگر سے غلام نبی صاحب کے فرزند تشریف لائے اور انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے والد کے آپریشن کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ صاحبزادے ایم۔ ایس۔ سی پاس ہیں۔ اسلیئے مجھے ان کی جہالت پر قدرے تعجب ہوا لیکن ان سے مختصر سی گفتگو کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اَن پڑھ جاہلوں کے مقابلے میں پڑھے لکھے جاہل زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ غلام جیلانی (یہ ان صاحبزادے کا نام ہے) نے کہا کہ میری ماں نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہارے ابا جس حالت میں بھی ہوں۔ انہیں واپس لے آؤ۔ ان کا کسی بھی قیمت پر آپریشن نہ ہونے دینا۔ ہم یہیں پیری فقیری کر کے ان کا علاج کریں گے -- یہ اعلان سن کر مجھے بے حد تاؤ آیا، کہ میں نے ناحق اپنا اور ڈاکٹروں کا وقت ضایع کیا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ایک پڑھا لکھا لڑکا اس قسم کی جاہلانہ باتیں کیسے کرتا ہے؟ مجھے اس بات کا سو فیصد یقین تھا۔ کہ جیلانی غیر ارادی طور پر اپنے باپ کے قتل کا باعث بنے گا۔ اس لیئے میں نے اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جیلانی اپنے باپ کو انسٹی چیوٹ سے لے آئے، میری ہی طرح ڈاکٹروں نے حیرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایسا کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن بے کار۔ جیلانی پر جنون طاری تھا۔ اور خود مریض بھی اپنے بیٹے سے متفق تھا۔

کچھ دن بعد مریض کو دہلی سے جموں لیجایا گیا۔ اس وقت اس کی حالت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پہلے سے بھی زیادہ خراب تھی۔ جموں میں چند روز قیام کے بعد اسے اپنے گھر پٹن پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس کی حالت تشویش ناک ہوگئی۔ اب اس پر غشی کے دورے پڑنے لگ گئے۔ اور جسم کا بایاں حصہ بھی متاثر ہونے لگا۔ مجھے اس گناہ کا اعتراف کرنے کی اجازت دیجئے کہ مریض کے بارے میں اس قسم کی تشویش ناک اطلاعات سے مجھے اندرونی طور پر ایک ''خوشی'' محسوس ہو رہی تھی۔ کہ ان ۔۔۔۔کو اپنی جہالت کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اب غلام جیلانی اور اس کی والدہ دونوں کو اپنی حماقت کا احساس ہوا ہے۔ اور وہ کفِ افسوس مل رہے ہیں کہ انہوں نے آپریشن کیوں نہ ہونے دیا۔ اَب وہ مریض کو دوبارہ دہلی لیجانے اور آپریشن کرانے کیلئے بھی تیار تھے۔ مریض کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ اور اس بدحواسی کے عالم میں اسے پٹن سے سرینگر لایا گیا۔ تاکہ آخری بار ڈاکٹر علی جان کو دِکھایا جاسکے۔ ڈاکٹر جان نے مریض کو دیکھ کر سخت ناراضگی کا اظہار کیا کہ اسے انسٹی چیوٹ سے آپریشن کے بغیر کیوں لایا گیا ہے۔ مریض کی حالت دیکھ کر انہوں نے اسے فوراً واپس گھر لے جانے کی ہدایت کی۔ ظاہر ہے کہ وہ مایوس ہو چکے تھے۔ میں مریض کی قسمت پر افسوس اور اسکے لواحقین پر غصے کا اظہار کرتے ہوئے دہلی چلا آیا۔

چند دن میں نے ٹیلی فون پر مریض کے بارے میں دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ اس کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ اور میں یہی سمجھا کہ مجھے جان بوجھ کر غلط اطلاع فراہم کی جارہی ہے۔ دو ایک دن کے بعد میری بیوی نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ چچا جان کی حالت واقعی سدھر رہی ہے۔ میں نے مذاقاً پوچھا کہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

علاج کون کرر ہا ہے۔ کیا خود حضرت عزرائیل ان کی دیکھ بھال کرر ہے ہیں۔؟ تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹری علاج ومعالجہ تو ترک کر دیا گیا ہے۔ اب ایک پیر صاحب ان کی دیکھ بھال کرر ہے ہیں۔ اپنی بیوی کی جہالت پر مجھے اس قدر غصہ آیا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ لیکن ٹیلی فون پر غصے کا اظہار کرنے میں بھی پیسہ لگتا ہے۔ اس لئے میں نے ایک قہقہہ بلند کر کے پیر صاحب کے تئیں اپنی حقارت اور نفرت کا اظہار کر دیا۔ اس واقع کو ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گذر گیا۔

پچھلے ہفتے میں سرینگر گیا۔ تو غلام نبی کا جشنِ صحت منایا جار ہا تھا۔ میرے سُسر غلام محمد جالبؔ کے ہاں ایک پُر تکلف دعوت کا اہتمام تھا' جس میں مجھے خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں میں نے غلام نبی کو پہلے ہی کی طرح ہر بات پر قہقہہ لگاتے دیکھا۔ ان کے چہرے کی رونق اور تازگی لوٹ آئی تھی۔ اور سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ وہ بغیر کسی سہارے کے چل رہے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھار ہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ شیو بھی خود ہی کرتے ہیں اور گھر سے بازار تک بغیر کسی سہارے کے آتے جاتے ہیں۔ وہ تقریباً صحت یاب ہو چکے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ رہی سہی کمزوری بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ آخر یہ انقلاب کیسے آیا۔ تو مجھے کونے میں بیٹھے ایک مرددرویش سے تعارف کیا گیا۔ کہ یہ ان پیر صاحب کی کرامت ہے۔

پیر صاحب کے چہرے پر مجھے ایک عجیب سا جلال نظر آیا۔ سر پر دیہاتی ٹوپی، چہرے پر مختصر سی داڑھی اور ایک کالے پھرن میں ملبوس پیر صاحب یوں تو ایک معمولی کسان نظر آر ہے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک غیر معمولی شخصیت سے متعارف ہو رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ جج ڈاکٹری علاج معالجے کے بعد مریض اور اِس کے لواحقین مایوس ہو چکے، تو کسی نے کہا کہ چرار شریف میں ایک پیر صاحب رہتے ہیں کہ جو بہت سے مایوس مریضوں کو ٹھیک کر چکے ہیں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا پیر صاحب کی خدمت میں پہنچ کر انہیں پٹن آنے کی دعوت دی گئی۔ خوش قسمتی سے پیر صاحب نے دعوت قبول کر لی۔ پٹن پہونچتے ہی اُنہوں نے اپنا ''روحانی علاج معالجہ'' شروع کر دیا، اور مریض کی بگڑتی ہوئی حالت سنورنے لگی، اور ایک ہفتے کے اندر اندر مرض میں واضح اور نمایاں افاقہ نظر آنے لگا۔ اور پھر ایک دِن مریض نے اپنی ٹانگ اور بازو بھی ہلانا شروع کر دیا۔ میں نے پیر صاحب سے پوچھا کہ ''آپ نے یہ معجزہ کیوں کر دکھایا؟''

''معجزہ۔ ہم نے نہیں رب العالمین نے دِکھایا ہے۔ ہم نے صرف دعا کی ہے۔''

پیر صاحب نے مختصراً جواب دیا۔

پیر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ چرار شریف کے رہنے والے ہیں اور معمولی پڑھے لکھے ہونے کے باوجود مذہبی مسائل پر اچھی دسترس رکھتے ہیں، اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتے ہیں، اور نذر و نیاز سے تقریباً بے نیاز ہیں۔ مختصر سی ملاقات میں، میں نے اندازہ کیا کہ بہت کم گو اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ میں نے کیمرے سے ایک تصویر لینے کی اجازت چاہی تو بڑی خوشی سے راضی ہو گئے۔ شام کے وقت، وہ نماز پڑھنے کے لئے حضرت بل تشریف لے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گئے اور میری ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی۔

میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ میں پیری فقیری کا قائل نہیں ہوں اپنی زندگی میں صرف سیّد میرک شاہ صاحب کی نورانی شخصیت سے متاثر ہوا ہوں لیکن اِن کی روحانیت سے زیادہ میں ان کی بے پناہ علمیت، فہم و فراست اور نفاست پسندی کا قائل تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر مجھے ایک روحانی سکون کا احساس ہوتا تھا۔ وہ فارسی کے بہت بڑے عالم اور قرآن کے بہت بڑے مفسّر تھے۔ لیکن نہ میں نے کبھی اِن سے کوئی معجزہ منسوب کیا اور نہ خود اُنہوں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا۔ چرار شریف کے پیر صاحب کا معاملہ کچھ دوسرا ہے۔ اُنہوں نے ایسی کرامت دکھائی ہے کہ میرا دل و دماغ ابھی تک اِس کی کوئی توجیہہ نہیں کرسکا ہے۔ میڈیکل سائنس کے مطابق جو مریض بغیر آپریشن کے ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا، وہ پیر صاحب کی کرامت سے اِس درجہ ٹھیک ہو گیا ہے کہ مجھ جیسے ''عقل پسند'' اور سائنس پرست حیران ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا، کہ اِس معجزے کے بعد میں پیری فقیری کا قائل ہو گیا ہوں۔ لیکن اِس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے سائنسی ایقان کی دیواروں میں کچھ شگاف ضرور پڑ گئے ہیں۔

......☆......

(۷ر جون ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شِکوہ اور جوابِ شِکوہ

مجھے رفتہ رفتہ اپنے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کی سادگی اور معصومیت پر پیار آنے لگا ہے، اور کبھی کبھی تو وہ ایسے بھولے پن کی بات کرتے ہیں، کہ ان کا مُنہ چُومنے کو جی چاہتا ہے۔ پچھلے ہفتے مقامی اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے اُنہوں نے شِکوہ کیا، کہ اخبار والے شیخ صاحب کی ہر بات کو توشہ سرخی بنا کر چھاپتے ہیں اور ریاست میں ہونے والے تعمیر و ترقی کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اور اِس کے بعد اُنہوں نے اپنی حکومت کی کارکردگی کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے یہ خوش کُن اعلان کیا کہ ریاست میں پندرہ ہزار بے روزگاروں کے لئے روزگار کا انتظام کیا گیا ہے۔ اِس غیر رسمی بات چیت میں قاسم صاحب نے تعمیر و ترقی کے متعلق اور بھی دلچسپ اور پُر از مُعلومات انکشافات کئے۔ لیکن دوسرے دن اخبار والوں نے جس خبر کو شہ سرخیوں کیساتھ شایع کیا۔ وہ تھا وزیر اعلیٰ کا شِکوہ اور اِس میں ناگزیر طور پر شیخ صاحب کا نام نمایاں طور پر آ گیا۔ وزیر اعلیٰ کو یقیناً افسوس ہوا ہوگا کہ ضمنی طور شیخ صاحب کا ذکر کرنے سے ایک بار پھر ترقیاتی کام کو ثانوی اہمیت حاصل ہو گئی۔ لیکن قاسم صاحب کو اس بات پر خفا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہونے کی بجائے صحافتی آداب اور منطق کو سمجھ لینا چاہیئے۔

اخبار والوں کو بھی دودھ ملائی بیچنے والوں کی طرح اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ خریدنے والے کس قسم کا مال پسند کرتے ہیں، باالفاظ دیگر بازار میں کس قسم کے مال کی کھپت ہے۔ جس طرح سخت گرمی میں ٹھنڈے کوکا کولا اور سخت سردی میں گرم چائے اور کافی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح وقت اور ضرورت کے مُطابق اخبار کی سرخیاں اور شہ سرخیاں ترتیب پاتی ہیں، دوسرے الفاظ میں جس خبر میں عوامی دلچسپی اور TOPICALITY کا عنصر زیادہ ہو، وہ اخبار والوں کیلیئے زیادہ اہم اور نمایاں بن جاتی ہے۔ چراغ بیگ اپنا نکتہ نظر واضح کرنے کے لئے کئی مِثالیں دے سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اِس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ وزیر اعلیٰ اخبار نویس نہ سہی، اخبار بین تو ہیں اور انہیں میرے بیان کی صحت اور صداقت کا اندازہ ہوگا۔ اخبار نویس کے لئے دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ خبر کا تعلق کس شخصیت سے ہے اور جو شخص جتنا اہم ہوگا۔ اِس کی ہر بات یا اِس سے متعلق ہر بات کو مقابلتاً زیادہ اہمیت مِلے گی، اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ فرض کیجئے، کہ جموں و کشمیر کانگریس کے صدر خان محمد ایوب خان اور جمہوری ایکشن کمیٹی کے نیتا غلام محمد سالار بیکوقت کشمیر کو ہندوستان کا ایک اٹوٹ انگ قرار دیں، تو ظاہر ہے، کہ خان صاحب کے بیان کو اخبار والے زیادہ نمایاں طور پر شایع کریں گے۔ اور سالار صاحب کو ان کی اپنی اوقات کے مطابق جگہ ملے گی (یہ الگ سوال ہے کہ مرکزی محکمہ سراغرسانی کی مہربانی سے سالار صاحب کے بیانات کو دلی کے اخبارات میں اِس اہتمام سے شایع کیا جاتا ہے، کہ جیسے وہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شیخ محمد عبداللہ سے بھی بڑے لیڈر رہوں)۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ اخبار والے ذاتی بیر یا عداوت کی وجہ سے کسی خبر کی اہمیت کو گھٹا یا بڑھا نہیں دیتے، بلکہ انہیں اس خبر بنانے والے کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے شیخ محمد عبداللہ کا نام صرف مقامی اخبارات کے لئے ہی نہیں، ہندوستان کے بڑے سے بڑے اخبار کے لئے صفحہ اوّل کی خبر ہے اور خدا جانے قاسم صاحب کو اس بات کا علم ہے یا نہیں، کہ لندن، امریکہ اور جرمنی کے ممتاز اخبارات اور رسائل میں بھی شیخ صاحب کے بیانات کو غیر معمولی اہتمام کیساتھ شایٔع کیا جاتا ہے اِن کی سیاست سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف اِن کی سیاسی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اگر سرینگر سے شایٔع ہونے والے اخبارات ان کی ہر بات کو شہ سرخیوں کیساتھ چھاپتے ہیں، تو یہ شیخ صاحب کیساتھ کوئی خاص رعایت نہیں، بلکہ صحافتی ضرورت اور تقاضوں کا الزام ہے۔ جس طرح ریڈیو کشمیر کو اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے غلام محمد سالار اور حلقۂ آری گام کے صدر تحصیل کے بیانات نشر کرنے پڑتے ہیں۔ اِسی طرح مقامی اخبارات کو اپنے قارئین کی دلچسپی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اخبار نویسوں سے تو قاسم صاحب کو یہ شکوہ ہے کہ وہ شیخ محمد عبداللہ کی ہر بات کو اُچھالتے ہیں اور تعمیر و ترقی کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن کیا اُنہوں نے کبھی سرکاری بھونپو (ریڈیو کشمیر) کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا ہے کہ جو صبح سے شام تک ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے بیانات تو نشر کرتا رہتا ہے، لیکن کبھی بھولے سے بھی شیخ محمد عبداللہ کا نام نہیں لیتا اور ان کی کوئی تقریر یا بیان نشر نہیں کرتا، ہاں اگر کوئی سیاسی چمار یا سُنار انہیں گالی دیکر اپنی روٹی کا انتظام کرنا چاہے، تو قاسم صاحب کا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ریڈیو کئی دِن تک اِس کی تشہیر کرتا رہے گا۔ جہاں تک سرکاری کارکردگی اور تعمیر وترقی کے میدان میں ہونے والے کام کا تعلق ہے، مجھے قاسم صاحب کی اِس بات سے اتفاق ہے کہ اخبارات میں اس کی مناسب تشہیر نہیں ہوتی ہے، لیکن وہ مجھے معاف کریں گے، کہ اس کا دوش مقامی اخبارات کی بجائے اِس سرکاری ایجنسی کو دیا جانا چاہیئے کہ جِسے محکمۂ اطلاعات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس طرح وزیراعظم مِسز اندرا گاندھی نے اپنی پبلسٹی کے لئے آل انڈیا ریڈیو۔ اور شمیم احمد شمیم نے اپنی مدح کے لئے ہفت روزہ ''آئینہ'' چالو کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہر ریاستی حکومت نے اپنی پبلسٹی کیلئے ایک ایک محکمۂ اطلاعات قائم کر رکھا ہے۔ اس محکمے کا کام ہی یہی ہے۔ کہ وہ ہر ممکن اور مناسب طریقے سے حکومت کی کارکردگی کی تشہیر اور اِس کے اصولوں کی (اگر اِس کے کوئی اصول بھی ہوں) تبلیغ کرے، اِس مقصد کے لئے وہ مقامی اور قومی اخبارات سے رابطہ قائم کر کے حکومت کی فتوحات کا چرچا کرتے ہیں اور اِس کی ناکامیوں پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔ اور اگر قاسم صاحب کو یہ احساس ہے، کہ وہ مقامی اخبارات کی کامیابیوں سے زیادہ اِس کی ناکامیوں اور محرومیوں کا چرچا کرتے ہیں، تو انہیں اپنے محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ کی کارکردگی کا جائزہ لینا چاہیے۔ انہیں شاید اس بات کا ابھی تک علم نہیں ہے کہ اس محکمے میں ریاست بھر کے تمام نالائق، نااہل، ناتجربہ کار اور ناہنجار افسر جمع کر دیئے گئے ہیں اور محکمے کے سب سے اعلیٰ افسر سے لے کر سب سے ادنیٰ مُلازم تک، کسی شخص کو یہ علم نہیں کہ اِس کے فرائض کیا ہیں اور افسروں کی اتنی بڑی فوج میں کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے دو لفظ لکھ پائے۔ محکمے کی جانب سے شایع ہونے والے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پریس نوٹوں کی زبان، اِملا، انشاء اور عبارت کی غلطیوں سے پُر ہوتی ہیں اور چراغ بیگ کو خاص طور پر اِس بات کا اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ کہیں محکمے کی طرف سے جاری کردہ کوئی پریس نوٹ بچوں کے ہاتھ نہ لگے، کہ اِسے پڑھکر ان کی زبان خراب ہوجائے گی۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جس محکمے کو حکومت کی زبان اور اِس کی شبھیہ IMAGE کا معمار ہونا چاہیئے تھا۔ اِس میں دُنیا بھر کے جاہل اور گنوار افسر بھرتی کیئے گئے ہیں، کہ جنہیں تعلقات عامہ تو کُجا بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے اخبار نویس، انہیں مُنہ لگانے کے لئے تیار نہیں (یہ الگ سوال ہے کہ اخبار نویسوں میں اِن سے بھی زیادہ اُجڈ، گنوار اور جاہل ''نمونے'' پائے جاتے ہیں)۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ قاسم صاحب کو شکوہ اخبار والوں سے نہیں، اِس محکمے سے کرنا چاہیے کہ جس کا نام ''سرکار کی پبلسٹی'' کرنا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جانکی ناتھ زتشی کے بعد یہ محکمہ ہمیشہ پڑھے لکھے جاہلوں یا سند یافتہ ان پڑھوں کی تحویل میں رہا۔ قاسم صاحب کو اگر واقعی اپنے کارناموں کی تشہیر مقصود ہے، تو انہیں ریڈیو کشمیر کا بائیکاٹ کر کے مقامی اخباروں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے (کیونکہ عام لوگوں نے ریڈیو کشمیر سے نشر ہونے والے پروپا گنڈا پروگراموں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے) اور یہ تعاون ناراضگی، دھمکیوں اور دھونس سے نہیں، صحیح قسم کے ذہنی رویے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ خوشامدی، چاپلوس اور تیسرے درجے کے گھٹیا اخبارات میں اشتہارات دینے سے تعمیر و ترقی کے کاموں کی تشہیر نہیں حکومت کی تذلیل ہوتی ہے اس کا خیال رکھے گا۔

(۳۱/اگست ۱۹۷۲ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اِنتقالِ پُر ملال

اسمبلی کا بجٹ اجلاس ختم ہونے سے پہلے ریاستی اسمبلی کے آزاد ممبر علی محمد نیا ئیک اتفاقِ رائے سے اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر منتخب ہوئے، اِس موقع پر وزیرِ اعلیٰ کے علاوہ حزبِ مخالف کے کئی اراکین نے بھی نیا ئیک صاحب کو مبارکباد دی، اور ان کے انتخاب کو جمہوریت کی اعلیٰ اقدار کی کامیابی سے تعبیر کیا۔ اپنی اِس عزّت افزائی پر خود نیا ئیک صاحب بھی بے حد مُسرور اور مغرور نظر آر ہے تھے۔ اور کیوں نہ ہو، چھ سال کی صحرانوردی کے بعد راہی کو اپنی منزل نظر آ رہی تھی۔ چراغ بیگ کو نیا ئیک صاحب کے ڈپٹی سپیکر منتخب ہونے پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ کیوں کہ اِن کے ڈپٹی سپیکر منتخب کئے جانے کی افواہ آج تین چار ماہ سے ہوا میں اُڑ رہی تھی اور کشمیر میں چوں کہ افواہیں خبروں سے زیادہ معتبر ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم نے 'اُڑتی ہوئی' پر فوراً یقین کر لیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ڈپٹی سپیکر بنا کر قاسم صاحب نے نیا ئیک صاحب کی خدمات کا حق ادا کیا۔ اور اِس طرح حزبِ مخالف کے دوسرے اراکین تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ ہر ممبر کو اِس کی خدمات کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اسمبلی اور انتخابات سے دلچسپی رکھنے والے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دوستوں کو معلوم ہوگا کہ نیائیک صاحب، ۱۹۹۶ء میں محاذِ رائے شماری کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اور اُنھوں نے پارٹی کے فیصلے کی خلاف ورزی کر کے عام انتخابات میں حصّہ لے کر ترال کے حلقے سے کامیابی حاصل کی تھی۔ پارٹی کے فیصلے کی خلاف ورزی اور کامیابی کے جُرم میں انہیں، اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو محاذ سے خارج کر دیا گیا تھا، اور اِس کے بعد سے یہ لوگ 'خارجی' کہلاتے ہیں۔ نیائیک صاحب اور ان کے ساتھیوں کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ ہمارے خیال میں بالکل صحیح تھا، کیوں کہ صرف ایک سال بعد مرزا محمد افضل بیگ کی قیادت میں محاذِ رائے شماری نے پنچایت سے لے کر پارلیمنٹ تک ہر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا، اور اِس طرح ''خارجیوں'' کی دُور اندیشی اور دانش مندی کا اعتراف کیا۔ لیکن اِس دوران میں زمانہ قیامت کی چال چل گیا تھا۔ عین انتخاب کے موقع پر شیخ صاحب اور بیگ صاحب کو ریاست سے ''خارج'' کر دیا گیا، اور اس طرح وہ خارجی کہلائے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترجہ تھا، میں بات کر رہا تھا، علی محمد نیائیک سابق جنرل سیکریٹری محاذ رائے شماری، حال ڈپٹی سپیکر قانون ساز اسمبلی کی۔ اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی کے بعد نیائیک صاحب حزب مخالف کی نشتوں پر بیٹھے۔ اور اُنھوں نے حتی المقدور اور حتی الامکان حزبِ مخالف کا رول ادا کیا۔ شمیم احمد شمیم کو اِس بات کا اعتراف ہے کہ پچھلی اسمبلی میں نیائیک صاحب نے اپنی بعض مجبوریوں کے باوجود، ان کا ساتھ دیا۔ اور اس طرح کبھی کبھی ایوان میں حزبِ مخالف کا احساس ہوتا رہا۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں نیائیک صاحب نے ایک بار پھر آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور کامیاب ہو گئے۔ لیکن

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کامیاب ہونے کیلیئے انہوں نے جو قیمت ادا کی، اس نے ان کی آزادانہ حیثیت کو کسی حد تک مشکوک بنا دیا۔ عین اس وقت جبکہ حکمران جماعت نے جلاوطنی، گرفتاری اور ہزار قسم کی دھاندلیوں سے انتخابات کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا تھا۔ نیا ئیک صاحب نے انتخابات کو آزادانہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ قرار دے کر حکومت کو ایمانداری اور دیانتداری کا وہ سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا، کہ جس کی اس وقت بہت ضرورت تھی۔ ۱۹۶۷ء کے انتخابات میں نیا ئیک صاحب پر یہ الزام تھا، کہ وہ حکمران جماعت کی در پردہ حمایت اور تعاون سے کامیاب ہو گئے اور ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں نیا ئیک کی اس حکمران نوازی نے اس شبہ کو مزید تقویت پہنچائی۔ چراغ بیگ نے بہت پہلے اندازہ کر لیا تھا کہ نیا ئیک صاحب کو اپنے۔ سرٹیفکیٹ کا صلہ ملنے والا ہے اور اسمبلی کی ڈپٹی سپیکری اس اہم خدمت کا ایک حقیر سا معاوضہ ہے۔

وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے نیا ئیک صاحب کو ڈپٹی سپیکر بنا کر ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ نیا ئیک صاحب اس آسانی کے ساتھ ڈپٹی سپیکری کے دام میں پھنس گئے۔ ملاؤں اور نیم ملاؤں کی موجودہ حزبِ مخالف میں نیا ئیک صاحب ہی ایک ایسے ممبر تھے کہ جو کبھی کبھی مصلحتوں کی قید سے آزاد ہو کر حکومت کی حجامت بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے، اور اسمبلی کے اس اجلاس میں انہوں نے کئی بار اپنی ان صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔ ان صلاحیتوں کو زیادہ نمایاں ہونے سے پہلے ہی حکمرانوں نے نیا ئیک صاحب کو ڈپٹی سپیکری کی زنجیروں میں کس لیا ہے اور اب یہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش کر دی گئی ہے۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

دفتر، موٹر اور شوفر کا کروفر نایئک صاحب کو آسایش، تحفظ اور شان وشوکت کے احساس میں مبتلا کر کے ان کی زبان کو مقفل کر دے گا اور اس طرح حزبِ مخالف کا ایک فعال ممبر Establishment کا حصہ بن جائیگا۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون! قاسم صاحب نے کس دانشمندی سے نایئک صاحب کی خدمات کا معاوضہ بھی چکا دیا اور انہیں حزب مخالف سے اُٹھا کر سرکار کی آرام دہ نشست کے ساتھ باندھ بھی دیا۔ مجھے یقین ہے اگر نایئک صاحب کچھ دیر اور انتظار کرتے، تو انہیں زیادہ قیمت مل سکتی تھی۔ ''تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا۔'' ہم قاسم صاحب کو ان کی سلیقہ مندی اور ہنر مندی کے لئے مبارکباد دیتے ہی ہیں۔ اور نایئک صاحب کے انتقال پرملال پر ان کی مغفرت کی دُعا کرتے ہیں۔

......☆......

(۳۱ر اگست ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بینگن کے پُجاری

سرینگر میں کچھ عرصہ پہلے ایک لطیفہ کافی روان دواں تھا یعنی ایک ہزایکسی لنسی منسٹر صاحب نے ایک دن اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے پوچھا کہ راجماش کی دال کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے، مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ بچارے ملازم نے غیاث اللغات کا یہ نازک مسئلہ کیسے سلجھایا، لیکن اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے، کہ وزارت کے مخملی گدے میں کوئی ایسا برگِ حشیش ضرور چھپا رہتا ہے، جس کی مہک سے اس پر بیٹھنے والا زندگی کی روزمرہ حقیقتوں سے کچھ الگ تھلگ ہوکر جمادات اور نباتات کے خاندان میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے جب میں نے پچھلی اتوار کو ڈی، پی صاحب کے فرزند کے سینما میں خواجہ غلام محمد صادق کو براجمان پایا، تو مجھے کچھ عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ یعنی کم ازکم ہمارے وزیرِاعلیٰ ایسے ہال میں تشریف رکھتے ہیں، جہاں سینکڑوں ''عوام'' بھی بیک وقت اُن کے ساتھ سانس لے رہے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں اور جذباتی ہوجاتے ہیں۔ چاپلوسوں، سیکریٹریوں، ڈائریکٹروں اور چیرمینوں سے دن رات مڈبھیڑ کرتے ہوئے کوئی بھی انسان رنگ اور خوشبو کے احساس سے، آنسوؤں کی موسیقی اور قہقہوں کے جلترنگ کے سوز وساز سے، جذبات کی خلش اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ضمیر کے پرششِ احوال سے بیگانہ ہوسکتا ہے، لیکن جب یہ انسان صادق صاحب کی طرز کا شریف، وضع دار اور کم گوش ہو۔ تو پھر زمانہ قیامت کی چال چلتا ہے۔ مجھے یہ خیال کر کے بڑی تسکین معلوم ہونے لگی کہ آج صادق صاحب کے کانوں میں مدتوں کے بعد اُن قہقہوں کی آواز گونجے گی، جو دل کی گہرائیوں سے نکلتے اور تازہ دودھ کی طرح صحت بخش لگتے ہیں۔ کیونکہ صادق صاحب کے کانوں میں اُن فرمائشی قہقہوں ہی کی آواز آتی رہی ہے، جو فنِ مصاحبت کا ایک لازم وملزوم حصہ ہوتے ہیں، اور جو کسی بدمعاش درویش کی دعا کی طرح باسی اور نفرت انگیز ہوتے ہیں۔ مجھے یہ خیال طمانیت بخشنے لگا، کہ آج صادق صاحب کو اصلی گھی کی طرح تالیوں کا بجتا ہوا ساز سُنائی دیگا جو اس وقت بجائی جاتی ہیں، جب آدمی واقعی دل سے کسی چیز کی داد دے یا اُسے پسند کرے اور اس طرح سے اُن پر اسد ژاٹھ کے نقلی پونڈوں کی مانند ان جعلی اور جھوٹی تالیوں کی حقیقت کھل جائے گی، جو کانگریس کے جلسوں میں کچھ پیشہ ور میر چودھری اور کرائے کے سامعین اشارے پر بجاتے ہیں۔ میرا خیال تھا، کہ شاید اصلی اور نقلی کا فرق پھر سے محسوس کر کے صادق صاحب کو ڈالڈا کی بجائے شُدھ چیزوں کی رغبت آجائے گی اور اس طرح سے ہماری ریاست کے اُفق پر ایک نئی روپہلی لکیر دھنک بن کر چمک اُٹھے گی لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی، جب میں نے دیکھا کہ ''اغواء'' کی اس سازش کا تدارک کرنے کے لئے حکومت کی ڈولی کے تمام گرگِ جہاں دیدہ کہار اُن سے پہلے ہی وہاں پہونچ گئے ہیں۔ اور انہیں پورے احتیاط سے اپنے جھرمٹ میں قید کئے ہوئے ہیں۔ ان باکمال اشخاص کی انسدادی تدابیر اس درجہ مکمل تھیں، کہ صادق صاحب پر کسی ایسے شخص کا سایہ پڑنے کا بھی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

احتمال نہ تھا، جو یا تو اُن کا ملازم نہ ہو۔ یا اُن کے پاس کسی حاجت سے نہ آیا ہو۔ بلکہ ایک عام شہری کی طرح اپنی ترنگ میں اُن پر معمول کی ایک صحت منداور فرحت بخش نظر ڈال سکے۔ کسی خوبصورت عورت کے عاشقوں کی طرح اقتدار کے پروانے بھی حافظ شیرازی کا یہ قول ہرگز نہیں بھول سکتے۔

یک لحظہ غافل بودم وصد سال گریہ مے کنم

چراغ بیگ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا، کہ فلم شروع ہوگئی اور اُس کی حیرت کے ساتھ ساتھ مسرت کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ جب میر نیل سین کے کے ''بھون شوم'' کا ٹائٹل نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ یہ ہماری فلم انڈسٹری کی انتہائی پاکیزہ اور شفاف فلموں میں سے ایک ہے اور اس نے ستیہ جیت رے کی شہرہ آفاق فلموں کی طرح نہ صرف دنیا بھر کے صاحبِ نظر حلقوں سے داد حاصل کی ہے۔ بلکہ ہندوستانی فلموں کے قحبہ خانے میں ایک نئ شرافت اور تہذیب کی طرح ڈالدی ہے۔ فلم کا موضوع نوکر شاہی اور دفتر شاہی کی باسی اور بے روح زندگی پر بڑا گہرا طنز ہے۔ اور میر نیل سین کی ہدایت کاری نے اس کو سحر ہلاہل کے درجے تک پہونچا دیا ہے، چراغ بیگ فلم کی بے لوث فضا میں لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ سوچتا رہا، کہ ہمارے اتنے بڑے افسروں کو اُن کے معیار کے مطابق یہ ''بے رنگ اور خشک'' فلم دیکھنے کی فرصت کیسے ملی۔ عام طور پر یہ صاحب اُن ''سینماؤں'' کے ''باکس'' میں نظر آتے ہیں، جہاں کولہے لٹکاتی ہوئی نیم عریاں و رقاصائیں اور چوما چاٹی میں مصروف بے ہنگم ہیرو، ہیروین سکرین پر دھما چوکڑی مچا رہے ہوں۔ بہت زیادہ ہوا، تو یہ افسر حبیب پینٹر کی قوالی پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اور اُس سے زیادہ ذوق ہوا۔ تو کسی پیشواز پہنے ہوئے ''بچے'' کی اداؤں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اچانک چراغ بیگ کو یاد آیا کہ اُن جگہوں پر بھی تو یہ لوگ وزیر اعظم کی سواری کے آگے پیچھے جاتے تھے۔ آج وہ سواری براڈوے آئی ہے۔ تو ''بھون شوم'' کا نصیب بھی جاگ اُٹھا ہے۔ آخر یہ لوگ بینگن کے پُجاری ہیں، یا بادشاہ سلامت کے فدائی۔۔۔ بہر کیف یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ اس کے بعد جو ہوا۔ دراصل وہ ''بھون شوم'' کے تبصرے کا سب سے زرین باب ہے۔ اس فلم میں ریلوے کے ایک بڑے افسر کی مضحکہ خیز حد تک ایمانداری پر فنکارانہ اور اشاراتی انداز میں کچھ چھینٹے اُڑائے گئے ہیں۔ چراغ بیگ کی اطلاع کے مطابق فلم دیکھنے کے فوراً بعد صادق صاحب کو اُن کے بہت سے مصاحب افسروں نے یہ فلم دیکھنے کے لئے مبارک باد پیش کی۔ اور اُن سے کہا، کہ اسی لئے تو ہم بھون شوم کی طرح مضحکہ خیز حد تک ایماندار نہیں بن سکتے۔ آخر آپ جیسے فن نواز وزیر اعلیٰ کے دور میں ہمارے فنکارانہ ضمیر کی داد نہ دی جائے، تو پھر کب دی جائے گی۔ اطلاع کے مطابق صادق صاحب نے اس نکتے کو سراہا اور غالبؔ کا یہ مصرعہ دہرایا۔

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر۔

باقی رہے ڈی، پی صاحب کے فرزند۔ اطلاع کے مطابق بہت سے افسروں نے اس شو کا انتظام کرنے کے لئے اُن کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور بڑے معنی خیز لہجے میں کہا ہے۔

''تیغ چوں بہ شکست خنجری شود''

(۳۰/ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کہ درویشی بھی عیاری ہے سُلطانی بھی عیاری

ایک ایسے شخص کی طرح جس نے ایک بار شادی کا مزہ چکھا ہو اور پھر رانڈ بان گیا ہو۔ سید میر قاسم بھی اپنی سیاسی دُلہن یعنی وزارت سے نکاح ثانی کے لئے کافی دنوں انگاروں پر لوٹتے رہے، آخر اُن کی تمنّا بھر آئی ہے اور وہ پھر بڑے سرور کے ساتھ گنگنا سکتے ہیں ؎

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

لیکن اُن کے سکریٹریٹ میں داخلے سے اُس عمارت کی پُرسکون جھیل میں گویا کوئی بھاری پتھر آن گرا ہے۔ اور لہروں کے دائرے دور دور تک پھیل گئے ہیں۔ قاسم صاحب طبعاً بڑے خلیق اور مِلنسار آدمی ہیں، اُنہوں نے بڑی دلنواز مُسکراہٹ اور بے حد میٹھی زبان پائی ہے۔ اور ان سے کسی کو کتنے بھی اختلافات کیوں نہ ہوں، وہ یہ بات بلاچوں و چرا تسلیم کریگا، کہ قاسم صاحب کو خلوت کی بجائے لوگوں کے جھُرمٹ میں زیادہ لُطف آتا ہے۔ دوسری طرف کچھ وقت سے ہمارے سیکریٹریٹ کا مزاج بڑا کم آمیز ہو گیا ہے، اور وہاں پرندوں کو بھی پرواز کرنے کے لئے رسپشنسٹ کا پروانہ حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ کچھ تو اپنی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ اِس بات کے پیش نظر کہ وہ کسی اور میدان میں شاید تیر نہ مار سکیں۔ اُنہوں نے اِسی میدان میں "سروگ، پشھ تہ پناہ دار" کے اصول کے تحت روز آزمائی شروع کر دی ہے۔ اور راویان با تدبیر کے مطابق اب تک نمایاں کارناموں کا مظاہرہ کیا ہے۔ قاسم صاحب نے رسپشنسٹ کو ہدائت کر دی ہے کہ جو شخص بھی اُن کا نام لے کر اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے۔ اُسے فوراً اجازت نامہ ملنا چاہئے۔ چنانچہ آج کل جہاں دوسرے وزراء کے دروازوں پر رات کی بجائے دن کو ہی اُلو بولتے نظر آتے ہیں۔ وہاں قاسم صاحب کے دروازے پر عاشقوں کا اسقدر ہجوم لگا رہتا ہے کہ اُردو شاعری کا محبوب بھی اُس پر حسد سے جل بھُن کر کباب ہو جائے۔ لیکن مصری کی ڈلی کی مٹھاس صرف قاسم صاحب کیے دروازے پر ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اندر جایئے، تو وہاں پانچ ہزاریوں، دس ہزاریوں وغیرہ کی صفیں حسبِ مراتب آراستہ رہتی ہیں اور قاسم صاحب کی دلنواز مسکراہٹ کے علاوہ سائل کے کشکول میں اور کوئی شئے نہیں گرتی۔ اس کے باوجود عاشق مایوس نہیں ہوتے، کیونکہ کچھ نہیں تو قاسم صاحب کی مہربانی سے اُنہیں سکریٹریٹ کے اُس شجرِ ممنوعہ کی سیر کا پاسپورٹ تو مل جاتا ہے، جس کی آرزو میں وہ قاسم صاحب کے آنے سے پہلے باہر تارکول کی سڑک پر چلچلاتی دھوپ میں دھکے کھاتے رہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ قاسم صاحب کا یہ داؤں ایک بڑی جنگ کا حصہ ہے۔ جس میں عوام کو سہولیت پہونچانے سے زیادہ حریفوں کے طریقِ کار سے تقابلی مطالعے کا احساس اُجاگر کرنا مقصود ہے۔ دیکھیئے حریفوں کے ترکش سے اس کا کونسا جواب برآمد ہوتا ہے۔

۳۰ / اکتوبر ۱۹۷۱ء

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

موسیٰ خان اور کپاس

غالباً وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کو بھی اُس استقبال کی مضحکہ خیزی اور پھوہڑپن کا احساس ہوا ہوگا، کہ جو ۷ ستمبر کو ان کی آمد کے سلسلے میں سرینگر کے ہوائی اڈے پر منظم کیا گیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے اس قسم کے ''تماشوں'' پر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ''منتظمین'' کو یہ مشورہ دیا، کہ وہ ان کی آمد پر ہر بار یہ استقبالیہ ناٹک نہ رچایا کریں۔ مسز گاندھی نئی دہلی کے ہوائی اڈے۔۔۔ پالم۔۔۔ پر ہر ماہ کم از کم ایک یا دو غیر ملکی سربراہوں یا مہمانوں کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ اور ان مواقع پر مہمانوں کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کرنے کے لئے پالم پر جو سینکڑوں اور کبھی کبھی ہزاروں ''عوام'' موجود ہوتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں کے یہ ''عقیدت مند'' اور ''مداح'' دس دس پندرہ پندرہ میل کا سفر طے کر کے پالم تک کیسے پہنچتے ہیں۔ یہ مسز گاندھی اچھی طرح جانتی ہیں۔ اور اسی لئے ان کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے، کہ سرینگر کے ہوائی اڈے پر اُن کا استقبال کرنے کے لئے ہر بار جو سینکڑوں مرد و زن (مرد کم اور زن زیادہ) موجود ہوتے ہیں، وہ کیوں اور کیسے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ۷ ستمبر کو انڈین ایرفورس کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جہاز سے اترتے ہی جب عبدالعزیز ٹورسٹ کی قیادت میں کرائے کے عوام نے اندرا گاندھی زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دئے، تو مسز گاندھی کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت اور معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی یہ خاموشی یہ کہہ رہی تھی، کہ سب کچھ جانتی ہوں، موسیٰ خان کو بھی کپاس کہتے ہو؟

غیر ملکی مہمانوں کے استقبال کے سلسلے میں یہ تکلف اور تصنع کسی حد تک جائز ہے، لیکن سرینگر کے ہوائی اڈے پر اپنے ہی ملک کی وزیر اعظم کے ساتھ جو تکلف برتا جاتا ہے، وہ فراڈ، بے ایمانی اور بد دیانتی کے مترادف ہے۔ اور اسے جتنی جلد ختم کیا جائے، بہتر ہوگا! چراغ بیگ کو امید ہے کہ ۷ ستمبر کو مسز گاندھی نے جو اشارہ دیا۔ وہ حکمران جماعت کے عاقلوں کے لئے کافی ہے!

ہمارے ہاں مصنوعی استقبالوں اور بناسپتی مظاہروں کی تاریخ بہت پرانی ہے، لیکن کثرتِ استعمال اور استحصال سے اب یہ خرافت اور خجالت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ شروع میں سکول کے بچے، ریشم خانے کے مزدور، میونسپلٹی کے خاکروب اور کچھ سیاسی گداگران تماشوں میں شریک ہوتے تھے اور مہمانوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی میزبانوں کو بھی گرمجوشانہ استقبال کا دھوکا ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ سکول کے بچے، ریشم خانے کے مزدور باغی، میونسپلٹی کے خاکروب بد دماغ اور سیاسی گداگر بدظن ہو گئے اور انہوں نے بار بار زندہ باد کے نعرے لگانے سے انکار کر دیا۔ جوں جوں حکمران غیر مقبول اور ناپسندیدہ بنتے گئے، اُن کے لئے استقبالوں کی ضرورت اور اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ اس لئے اب طالب علموں کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بجائے استادوں، مزدوروں کی جگہ سرکاری ملازموں اور خاکروبوں کی جگہ تنخواہ دار سیاسی کارکنوں نے لی۔ پچھلے چھ سات سال کے دوران گرلز کالجوں اور گرلز سکولوں کی معلمات اور طالبات ان سرکاری استقبالوں میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے ۷ ستمبر کے استقبال میں عوام کے مقابلے میں خواص اور مردون کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی!

۷ ستمبر کو سرینگر کے ہوائی اڈے پر مشہور کانگریسی کارکن عبدالعزیز (جو زندگی بھر سرینگر سے باہر نہیں گئے ہیں، لیکن ٹورسٹ کہلاتے ہیں) کی ہدایت اور قیادت میں استقبال کے نام پر جو مسخرہ پن ہوا، اس نے مسخرے پن کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ دئے۔ ڈیڑھ دو روپیہ یومیہ اجرت پر لائے گئے۔ اڑھائی تین سو دیہاتیوں کو یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا، کہ انہیں کس کا استقبال کرنے کے لئے ایرپورٹ پر سجا دیا گیا ہے۔ دوڑ بھاگ میں سکول کی استانیوں کو ائیرپورٹ روانہ کرتے وقت یہ ہدایت بھی نہیں دی گئی تھی۔ کہ انہیں کس نعرے کا کیا جواب دینا ہے۔ سرکاری ملازموں کو ایرپورٹ پر تعینات کرتے وقت واضح طور پر یہ حکم نہیں دیا گیا تھا، کہ ان کے لئے بھی زندہ باد کے نعرے بلند کرنا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا، کی عین موقع پر جب پردیش کانگریس کے جیورسٹ مسٹر عبدالعزیز ٹورسٹ نے ''لانگ لیو'' کا نعرہ دیا۔ تو اندرا گاندھی کے استقبال کرنے والے خواتین وحضرات نے بے ساختہ ''عبداللہ'' کہہ کر اپنے دل کی بات زبان پر لائی۔ جب ٹورسٹ صاحب نے خشمگین آنکھوں سے اپنے 'عوام' کو ان کی غلطی کا احساس دلایا، تو انہوں نے لانگ لیو صادق صاحب کے نعرے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

بلند کرنا شروع کر دئے۔ اس مرحلے پر مسز گاندھی کرائے کے عوام کے بہت قریب آ گئیں تھیں۔ اور ٹورسٹ صاحب خاصے بدحواس نظر آرہے تھے۔ اس بدحواسی کے عالم میں انہوں نے استانیوں اور دیہاتیوں کو حکم دیا، کہ لانگ لیو کے جواب میں صادق صاحب مت کہو، اندرا گاندھی کہو'' اور جب ''عوام'' نے لانگ لیو اندرا گاندھی'' کی مالا جپنا شروع کی، تو اندرا گاندھی ایک بار پھر مسکرا دیں۔ یعنی موسیٰ خان کو بھی کپاس! اس استقبال کا سب سے حوصلہ شکن، توہین آمیز اور مضحکہ خیز پہلو یہ تھا، پانچ پونے پانچ سو کے اس 'عوام' میں پانچ چھ افراد کے علاوہ کوئی نعرے کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ حاضرین کو صرف حاضری کی اجرت دی گئی تھی نعرے دینے کی نہیں۔ ایسے مواقع پر نعروں کا جواب دینے کے لئے پانچ آٹھ آنے زیادہ بھی دئے جائیں۔ تو میرا خیال ہے، کہ زیادہ خرچہ نہیں آئے گا۔ حکمران جماعت کے ٹھیکیداروں کو آئندہ سے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے۔

جب سے صادق صاحب اور قاسم صاحب کے درمیان رقابت، کی چنگاریاں مخاصمت کی آگ بن گئی ہیں۔ کانگریس کے سیاسی جلسوں، سماجی تقریبوں اور استقبالیہ مظاہروں میں بھی مسخرے پن کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ اور اس کی ایک جھلک مسز گاندھی کی آمد کے سلسلے میں منظم کئے گئے استقبال میں بھی دکھائی دی۔ نعرہ باز ٹورسٹ نے جب کئی بار قائد کاروان جناب صادق صاحب زندہ باد کے نعرے لگائے تو قاسم صاحب کے ایک چمچے سے رہا نہ گیا، اور انہوں نے بڑے زور سے، میر کاروان، سید میر قاسم زندہ باد'' کا نعرہ بلند کیا۔ یہ ''حادثہ''

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اس سے پہلے بھی کئی تقریبات میں ہو چکا ہے، کہ محل بے محل دونوں لیڈروں کے چمچوں نے اپنی عقیدت اور وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے زندہ باد کے نعرے ٹکرائے ہیں۔لیکن مصنوعی استقبال کے پس منظر میں یہ بچگانی حرکت اتنی بھونڈی لگی۔ کہ چراغ بیگ جیسا منہ پھٹ اور گستاخ آدمی بھی شرم سے پسینے پسینے ہو گیا۔کیا صادق صاحب اور قاسم صاحب اپنے چمچوں کو وقت بے وقت ٹکرانے سے روک نہیں سکتے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کہ یہ سب کچھ ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہو رہا ہو۔

پردیش کانگریس کی استقبالیہ تقریبات میں چونکہ اخباری نمائیندے بیرونِ ریاست کے سرکاری افسر اور کچھ واقعی معزز شہری موجود ہوتے ہیں۔اس لئے پردیش کانگریس کے لیڈروں سے مندرجہ ذیل گذارشات کروں گا۔ان پر عمل کرنے سے لیڈروں کو نسبتاً کم خفت اور ذلت اُٹھانا پڑے گی:

(۱) عبدالعزیز ٹورسٹ کو کسی جلسے یا استقبالیہ تقریب میں شرکت سے باز رکھا جائے۔یہ شخص اچھے خاصے سیاسی جلسے کو "احمد بازی گر کا تماشہ" بنا دیتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ٹورسٹ صاحب نے زندگی بھر والنٹیر رہنے کی قسم کھائی ہے!

(۲) استقبالیہ تقریبات میں شرکت کے لئے دور دراز سے دیہات سے لائے گئے مزدوروں کو استقبال کرنے کی باضابطہ تربیت دینا چاہیئے۔کم از کم انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انہیں کس کا استقبال کرنے کے لئے اُجرت دی جارہی ہے۔اور یہ کہ کس نعرے کا کونسا جواب دینا چاہیئے۔

(۳) قاسم صاحب کو اپنے چمچوں سے یہ کہہ دینا چاہیئے، کہ زندہ باد کہنے سے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ان کی حکومت قائم نہیں ہوگی۔

(۴) صادق صاحب کو اپنے چمچوں سے یہ کہہ دینا چاہئے، کہ وہ صادق صاحب زندہ باد کے ساتھ قاسم صاحب زندہ باد کے نعرے بھی بلند کرتے رہیں۔ اور ایسا کرنے سے ان کی حکومت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔

(۵) سرکاری ملازموں کو واضح طور پر یہ ہدایت دی جانی چاہئے، کہ اگر وہ نعروں کا جواب نہ دیں۔ یا مدھم آواز سے دیں، تو ان کے گرانی الاونس میں کمی ہونے کے علاوہ ان کی ترقی کے امکانات بھی محدود ہو جائیں گے!

(۶) کانگریس کے کسی جلسے میں ''لانگ لیو'' کا نعرہ نہیں لگنا چاہئے، کیونکہ اس نعرے کے لئے ریاست میں ایک جواب مخصوص ہے، اور وہ ہے ''عبداللہ ''۔۔۔''لانگ لیو'' کا نعرہ بلند کرنے والے ہر کانگریسی کارکن کو بنیادی ممبرشپ سے خارج کر دینا چاہئے، کیونکہ وہ ''اندر'' سے شیخ عبداللہ کا عقیدت مند ہے۔

(۷) محترمہ زینب بیگم کو نعرے بلند کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ انہیں شاید معلوم نہیں، کہ ان کے نعرے دینے کو کتنا معیوب اور ناموزون سمجھا جاتا ہے۔

(۸) مسز اندرا گاندھی کو معلوم ہو چکا ہے، کہ کشمیر کے لوگ ان سے بے پناہ عقیدت اور محبت کرتے ہیں۔ اس لئے گرمجوشانہ استقبال کر کے بار بار اس کا یقین دلانے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔

......☆......

(۱۵ر ستمبر ۱۹۷۱ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آخری ملاقات

"صادق صاحب چل بسے" یہ ٹریڈ کمیشن کے سیکریٹری عبدالواحد کی آواز تھی۔ اُس وقت صبح کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ اور میں ایک غیر ملکی نامہ نگار کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ نامہ نگار کو کشمیر میں انتخابی دھاندلیوں کے موضوع سے گہری دلچسپی تھی اور اسے کسی ستم ظریف نے میرا پتہ بتادیا تھا۔ کہ دوران گفتگو کئی بار ناگزیر طور پر صادق صاحب کا ذکر بھی آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، کہ ہماری گفتگو کس نتیجے پر پہنچی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اور عبدالواحد نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے صادق صاحب کے انتقال کی خبر سُنائی۔ میں نے اس گہرے صدمے پر اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد مجھے احساس ہوا، کہ ایسا کرنا ممکن نہیں، نامہ نگار نے میرے کرب کا اندازہ کرتے ہوئے میری مشکل حل کردی۔ وہ دوسرے ہفتے کے لئے وقت مقرر کرکے مجھ سے رخصت ہوگیا، اور میں صادق صاحب کی موت، ان کی زندگی اور ان کی شخصیت کے بارے میں سوچنے کے لئے تنہارہ گیا۔

صادق صاحب کے انتقال کی خبر میرے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ابھی آٹھ دس دن پہلے چنڈی گڈھ کے پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ میں انہیں دیکھ کر آیا تھا اور ان کی حالت سے میں نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ ان کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ خبر سُن کر مجھے کچھ دیر کے لئے اس پر اعتبار کرنے میں تامُل ہوا۔ صادق صاحب کی موت ایک فرد ہی کی نہیں۔ ایک دور اور ایک سٹائل کی موت تھی اور اس لئے اس کا یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں، کہ میں صادق صاحب سے پہلی بار کب اور کہاں ملا تھا؟ میں اپنے حافظے پر زور دے کر اس پہلی ملاقات کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ میرے ذہن اور فکر کے نگار خانے میں ان کی تصویر مکمل ہو جائے، لیکن اس وقت میں ان سے اپنی آخری ملاقات کا احوال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جس کا شرف مجھے ۳۰ نومبر کو چنڈی گڈھ کے پوسٹ گریجویٹ انسٹی چیوٹ میں حاصل ہوا، اور جہاں انہوں نے ۱۲ دسمبر کو ایک زبردست دفاعی جنگ لڑنے کے بعد فرشتہ اجل کے سامنے ہتھیار ڈال دئے!

چنڈی گڈھ میں آخری بار ملنے سے پہلے میں ان سے ۱۵ر اکتوبر کو دلی میں ملا تھا۔ اس وقت ان کی صحت نسبتاً اچھی تھی۔ اور وہ کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ میں چونکہ دو دن بعد یورپ اور امریکہ کے سفر پر روانہ ہونے والا تھا، اسی لئے اسی موضوع پر زیادہ باتیں ہوئیں۔ وہ خود کبھی ہندوستان سے باہر نہیں گئے تھے اور ان کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا کہ ان کے دل میں بھی باہر جانے کی بڑی خواہش ہے۔ میں نے پوچھا، کہ آپ باہر کا ایک چکر لگا کے کیوں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نہیں آئے۔ ''اب آپ جا رہے ہیں، تو ہمارے جانے کی کیا ضرورت ہے، آپ واپس آکر ''آئینہ'' میں اپنے سفر کی روداد لکھیں گے''۔ ہم وہی پڑھ کر لطف اُٹھائیں گے''۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور ٹال گئے۔ انہیں دراصل اپنی خرابی صحت کا احساس تھا اور پچھلے ڈیڑھ سال کے دوران یہ احساس کچھ زیادہ شدید ہوگیا تھا لیکن دوسری طرف وہ اپنے مخالفوں اور اپنے دشمنوں پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ بالکل تندرست اور چاق و چوبند ہیں۔ اسی کشمکش نے ان کی صحت اور کمزور کردی تھی اور ان کی بیماری نے ان پر زیادہ زبردست حملے شروع کردئے تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے صادق صاحب سے پوچھا کہ ان کے لئے امریکہ سے کیا لاؤں، تو کہنے لگے کہ ''آپ خود واپس آجائیں ،تو بڑی بات ہے۔ ہم آپ کی زبانی وہاں کے حالات سُننے کے لئے منتظر رہیں گے۔ اُس وقت نہ مجھے اور نہ صادق صاحب کو اس بات کا وہم وگماں تھا، کہ میرے سفر کی روداد سُننے سے پہلے ہی وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے ہونگے۔

میں ۱۹ر نومبر کو کشمیر پہنچا تو معلوم ہوا کہ صادق صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ ان کی خرابیٔ طبیعت سے ہم کچھ مایوس سے ہوگئے تھے۔ سوچا ایک دو دن میں ٹھیک ہوجائیں گے، دو تین دن بعد دریافت کیا، تو معلوم ہوا، کہ انہیں یرقان ہوگیا ہے۔ اور انہیں اسی حالت میں چندی گڈھ لیجایا گیا ہے۔ پھر چندی گڈھ سے تشویش ناک اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ اور ان کی حالت دن بدن خراب ہوگئی۔ چند دن بعد اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ وہ پہلے سے بہتر ہیں اور ڈاکٹر ان کی حالت کے متعلق پُرامید ہیں۔ صادق صاحب کے صاجزادے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رفیق صادق نے بھی ٹیلیفون پر اس کی تصدیق کی، لیکن نہ معلوم مجھے معتبر ذرائع سے موصول ہونے والی ان خبروں پر یقین کیوں نہیں آیا۔ اور ۲۹ نومبر کو میں صادق صاحب کی عیادت کے لئے دہلی سے چندی گڈھ روانہ ہو گیا۔ چندی گڈھ جانے کے لئے یہ میرے لئے پہلا موقع تھا۔ اور ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر ہی میں کچھ مایوس ہو گیا۔ دراصل تاج محل کی طرح چندی گڈھ کی شہرت اتنی زیادہ ہے، کہ پہلی بار دیکھ کر کسی قدر مایوسی ہو جاتی ہے۔ اس شہر میں ایک عجیب سی یکسانیت اور بے جان خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے اور مجھے یوں طرح لگا کہ میں عیسائیوں کے ایک بڑے قبرستان میں آ گیا ہوں۔ میں پوسٹ گریجویٹ انسٹی چیوٹ کے محل وقوع سے ناواقف تھا۔ لیکن میرے پاس سردار امر سنگھ انبالوی کا پتہ تھا۔ اسلئے میں ریلوے سٹیشن سے سیدھے ان کے ہاں پہنچا۔ انبالوی صاحب میری غیر متوقع آمد پر قدرے حیران ہو گئے۔ میں نے انہیں یوں بے وقت آنے کا سبب بتایا اور وہ میرے ساتھ پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ صادق صاحب کو ۱۹۴۷ء سے قبل جانتے ہیں۔ اور وہ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ انبالوی صاحب کو میری ہی طرح اپنی آواز سُننے کا بہت شوق ہے۔ اسلئے انہوں نے صادق صاحب سے اپنے تعلقات کی تاریخ مفصل طور بیان کرنا شروع کی اور باتوں باتوں میں گیارہ بج گئے۔

سردار سنگھ انبالوی کو لیکر جب میں پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ پہنچا، تو معلوم ہوا، کہ صادق صاحب کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ اور ڈاکٹروں کو کسی قدر تشویش ہو گئی ہے۔ اسی دن سرینگر سے غلام محی الدین قرہ بھی چندی گڈھ پہنچ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

گئے تھے اور گھر کے سبھی لوگ پریشان نظر آرہے تھے۔ صادق صاحب کے سیکورٹی آفیسر عبدالحفیظ اور ان کے پرسنل اسسٹنٹ نذیر احمد نے مجھے بتایا کہ کل سے ان کی حالت پھر بگڑ گئی ہے۔ اور اب بیماری ایک تشویش ناک مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ اس حالت میں ان سے ملنا اور ان کی مزاج پرسی کرنا مجھے کچھ نامناسب سا معلوم ہوا۔۔۔۔۔ نذیر احمد نے بتایا، کہ ڈاکٹروں نے انہیں باتیں کرنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ اس لئے میں رفیق اور قرہ صاحب سے ہی ان کی حالت دریافت کرنے پر قانع تھا، کہ عبدالحفیظ نے آکر بتایا گیا، کہ ''صادق صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں''۔ معلوم ہوا، کہ جب صادق صاحب کو بتایا گیا کہ، میں مزاج پرسی کے لئے آیا ہوں، تو انہوں نے مجھے اندر بُلایا۔ اندر جانے سے پہلے مسٹر حفیظ نے مجھ سے کہا کہ میں ان سے زیادہ باتیں نہ کروں، کیونکہ ڈاکٹر نے انہیں زیادہ باتیں نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پی جے کمرہ نمبر ۲۹ میں اسوقت میرے علاوہ صادق صاحب کی ہمشیرہ محترمہ زینب بیگم اور ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام محی الدین قرہ بھی تھے۔ صادق صاحب کے پلنگ کا سرہانے والا حصہ کچھ اوپر کو اُٹھایا ہوا تھا اور وہ اسی کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی، جو بقول زینب بیگم پہلے کے مقابلے میں بہت کم تھی، یہ یرقان کا اثر تھا۔ مجھے محسوس ہوا، کہ چہرے پر ہلکی سے سوجھن بھی ہے۔ انہیں کھانسی آرہی تھی اور معلوم ہو رہا تھا، کہ کھانستے ہوئے انہیں خاصی تکلیف ہو رہی ہے۔ میں نے داخل ہوتے ہی سلام کیا، تو انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

''آپ کب آئے؟'' انہوں نے مدھم آواز میں پوچھا، آج ان کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔''

''میں آج ہی دلی سے آیا ہوں'' میں نے جواب دیا۔

''گھوم آئے آپ، امریکہ کیسا لگا آپ کو''

صادق صاحب کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ آئی، جو ابھرتے ہی ڈوب گئی۔ انہیں اس وقت بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ اور وہ درد کی شدت کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔

''جی ہاں آپ ٹھیک ہو جائیں گے، تو میں اپنے سفر کا حال سُناؤں گا''۔ میں نے ان کے قریب جا کر کہا۔

''یہاں بیٹھ جایئے''۔ صادق صاحب نے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور میں بیٹھ گیا۔

''آپ کہئے کہ اب آپ کا کیا حال ہے''

میں نے صادق صاحب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ میرے سوال کے جواب میں صادق صاحب نے فیض کا ایک شعر پڑھا اور میں ان کی شعر فہمی، سخن شناسی اور حاضر جوابی کی داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

صادق صاحب کو اردو ہی نہیں، کشمیری اور فارسی کے بہت سے شعر زبانی یاد تھے، اور وہ نجی محفلوں میں اکثر شعر و ادب سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے،

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران وہ کبھی کبھی کاغذ کے ایک پُرزے پر کوئی دلچسپ شعر یا فقرہ لکھ کر مجھے بھیجتے، میں جواباً کوئی شعر بھیجتا، اور وہ محظوظ ہو جاتے۔ فیض ان کا دوست اور محبوب شاعر تھا۔ اور انہیں فیض کا بیشتر کلام زبانی یاد تھا لیکن اس وقت جبکہ وہ موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کی آواز بھی صاف اور واضح نہ تھی۔ کھانسی کے بار بار حملے سے انہیں سخت تکلیف ہو رہی تھی، میری مزاج پرسی کے جواب میں یہ شعر پڑھ کر انہوں نے مجھے چونکا دیا۔ اس شعر میں انہوں نے اپنی حکایت اور احباب کی شکایت سب کچھ سمو کے رکھ دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، کہ زندگی بھر اپنے اندرونی جذبات کے اظہار کو ضبط اور تہذیب کا پابند رکھنے کے بعد اب صادق صاحب اپنے زخموں کی نمائش کرنا چاہتے ہیں۔ تکلف، وضع داری اور خودداری کی وہ دیواریں مسمار ہو چکی تھیں کہ جنہوں نے صادق صاحب کو صرف دنیا سے ہی نہیں، خود اپنے آپ سے بھی چھپا رکھا تھا، اس شعر میں اس اندرونی کرب اور کشمکش کی بھرپور تصویر ملتی ہے، کہ جس سے پچھلے تین چار سال کے دوران انہیں گذرنا پڑا۔ لیکن آج یہ پہلا موقعہ تھا، کہ انہوں نے برجستہ اور برملا طور اس کا اظہار کیا۔ غالباً انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا، کہ اب وہ زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے۔ اور اسی لئے ان کی باتوں میں وہ گہری جذباتیت آ گئی تھی، کہ جو اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی ہے۔ ''میں آپ کا مشکور ہوں، کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور آپ یہاں تک آئے''۔ صادق صاحب نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ اور مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا، کہ شاید یہ میری ان سے آخری ملاقات ہو۔ میں انہیں پچھلے آٹھ دس سال سے جانتا ہوں۔ اور

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

۱۹۶۴ء میں وزیر اعلیٰ بننے کے بعد سے میرے ان سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ لیکن میں نے ان کی زبان سے کبھی اس قسم کے جذباتی جملے نہیں سُنے تھے۔ صادق صاحب کی انا نے ہتھیار ڈال دئے تھے۔ اور وہ ایک سرد مہر، بے نیاز اور وضع دار سیاست دان کی بجائے ایک عام آدمی کی طرح جذبات سے مغلوب نظر آرہے تھے۔

''آپ کو تکلیف ہو رہی ہے، آپ باتیں نہ کریں'' میں نے صادق صاحب سے کہا۔

''نہیں نہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، صرف کھانسی آ ہی ہے، اور اس کی وجہ سے یہاں درد ہوتا ہے''۔ صادق صاحب نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ دراصل میں بہت سخت جان ہوں''۔ ان کے ہونٹوں پر ایک بار پھر لطیف سے مسکراہٹ نمودار ہوئی اور یہ میرے لئے صادق صاحب کی آخری مسکراہٹ تھی!۔

اتنے میں کچھ ڈاکٹر اندر آگئے اور ہمیں باہر جانے کے لئے کہا گیا۔ میں اس خیال سے باہر آیا کہ رخصت ہونے سے پہلے میں ان سے ایک بار پھر ملوں لیکن کچھ دیر بعد جنرل مانک شاہ اور درگا پرشاد آئے اور صادق صاحب ان سے باتیں کرتے رہے۔ بعد میں ان کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوگئی اور میں یہ سوچ کر دو تین دن بعد پھر آؤں گا، چندی گڈھ سے چل دیا۔

اس کے بعد جنگ شروع ہوگئی۔ اور پھر چندی گڈھ جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن ٹیلیفوں پر صادق صاحب کی خیر و خیریت دریافت کرنے پر معلوم

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہوا، کہ ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جارہی ہے۔ پھر ایک دن اندر موہن آئے اور انہوں نے کہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے، کہ ہفتہ دس دن تک انہیں انسٹی چیوٹ سے چھٹی دی جائے گی اور دو دن بعد یہ خبر آئی کہ انہوں نے انسٹی چیوٹ سے ہی نہیں ساری دُنیا سے ہمیشہ کے لئے چھٹی لی ہے۔

اِنا للہ و اِنا اِلیہ راجعوُن!

......☆......

(۷/جنوری ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نائب وزیر کی نائب تحصیلداری

دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ''شبستان'' کے اپریل اور مئی کے شمارے میں کشمیر کی دو سیاسی شخصیتوں کے طویل انٹرویو شائع ہوئے ہیں۔ ایک وزارتِ خارجہ کی پالیسی پلاننگ کمیٹی کے چیئرمین شری درگا پرشاد در اور دوسرا مرکزی کابینہ میں ریلوے کے نائب وزیر محمد شفیع قریشی کا۔ در صاحب اور قریشی صاحب دونوں کا تعلق کانگریس سے ہے، اور مختلف سیاسی مسائل خاص طور پر کشمیر کے متعلق ان کے خیالات میں بجا طور پر ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے، لیکن جہاں جذبات کے اسلوب، اظہار کے پیرائے، زبان کی شائستگی اور لہجے کی شیرینی نے ڈی پی صاحب کی شخصیت کو وقار بخشا ہے وہیں قریشی صاحب کی خود ستائی، خود نمائی، تنگ نظری اور غلط بیانی نے ان کے چھچھورے پن کو نمایاں کر دیا ہے۔ ڈی پی صاحب کے انٹرویو کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کسی اچھے ماحول میں ہوئی ہے اور ان میں بات کرنے کا سلیقہ ہے۔ انہیں اپنے پر اعتماد ہے اور وہ سیاسی اختلافات کے باوجود بزرگوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ اِس کے مقابلے میں قریشی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

صاحب کے خیالات سے متعارف ہونے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن میں اِس نوجوان کی صحت خراب رہی ہے۔ زبان و بیان کی اصلاح پر کسی نے توجہ نہیں دی ہے اور کشمیری عوام کی بدبختی سے مرکزی وزارت میں نائب وزیر بننے کے باوجود اسے اپنے پر اعتماد نہیں ہے۔ اس کے تحت الشعور میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ وہ جب تک کشمیری عوام اور ان کے رہنماؤں پر گند نہ اُچھالے، ہندوستانی لیڈروں کی۔۔۔ نگاہوں میں اُس کی وفاداری مشکوک رہے گی۔ دُرگا پرشاد در مرکزی حکومت میں ایک اہم کلیدی منصب پر فائز ہیں اور اِس وقت اُن کی ہر بات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اِس کے باوجود شیخ محمد عبداللہ کے متعلق انہوں نے اپنا نکتۂ نظر ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''مجھے شیخ محمد عبداللہ کے دور پر فخر ہے۔ مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ میں اِس دور سے وابستہ رہا۔ میرے ذہن پر اِن کی سیاسی تعلیم کا گہرا اثر ہے۔ میں اپنے آپ کو ان کا ممنون و احسان مند سمجھتا ہوں، ان کے بدلنے کی بہت سی وجوہات ہیں، ایک لفظ میں بیان کروں تو اس کو ایک عظیم سانحہ کہہ سکتا ہوں، ایک زبردست ٹریجڈی۔۔۔ میں ان کی ذات سے اب بھی پُر امید ہوں۔ شیخ صاحب ایک بہت بڑے محبِ وطن ہیں میں کبھی یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں، کہ ان کی قوم پرستی اور بالغ نظری میں ذرا بھی فرق آیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ضرور حقیقتِ حال کو دیکھیں گے۔ حالات کا تجزیہ کریں گے، کشمیر اور ہندوستان کی فلاح و بہبود کا خیال کریں گے۔''

(شبستان، اپریل ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

چراغ بیگ ڈی پی صاحب کا زبردست سیاسی ناقد اور نکتہ چین ہے۔
اس نے اِن کی بُری باتوں کی ہی نہیں، اچھی باتوں کی بھی بُرائی کی ہے اور اس اخبار کے صفحات گواہ ہیں کہ اپنی زندگی کے سات سال میں ''آئینہ'' نے ان کے خلاف جہاد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، لیکن اُنہوں نے جس اخلاقی جرأت اور دیانتداری سے شیخ صاحب کی عظمت اور اِن سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا ہے، اِس سے میری نگاہوں میں ان کا اپنا مرتبہ بُلند ہوا ہے۔ اِس کے برعکس محمد شفیع قریشی نے اپنے طویل انٹرویو میں ایکبار بھی شیخ صاحب یا ان کے کسی ساتھی کا ادب اور احترام سے نام نہیں لیا ہے۔ قریشی صاحب کے خیال میں شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کی آزادی، عزّت اور وقار کو بلند کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کیا ہے اور کوئی قربانی نہیں دی ہے۔ کشمیر کی سیاسی تاریخ سے واقفیت نہ رکھنے والا کوئی شخص اگر صرف قریشی صاحب کا انٹرویو ہی پڑھ لے تو وہ نتیجہ اخذ کرے گا، کہ شیخ محمد عبداللہ ایک ظالم و جابر حکمران تھا اور محمد شفیع قریشی نام کے کسی مجاہد نے اِس کے خلاف جدوجہد کرکے کشمیر کو آزاد کرایا ہے۔ اِس کے بعد وہ اِس مجاہد کی تلاش کرتا ہوا نئی دہلی کے ریلوے بھون میں پہونچے گا۔ جہاں قریشی صاحب مال گاڑیوں کا حساب کتاب ٹھیک کرتے ہوئے پائے جائیں گے۔

دُرگا پرشاد در، شیخ صاحب کو قریب سے جانتے ہیں، انہوں نے تحریکِ حُریت کشمیر میں شانہ بشانہ ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ شیخ صاحب کے بارے میں ان کے خیالات آپ نے ملاحظہ کیئے۔ اب قریشی صاحب کی گوہر افشانی ملاحظہ کیجیئے:

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

"شیخ صاحب کا جمہوریت پر کبھی یقین نہیں رہا۔ اُنہوں نے الیکشن نہیں کرائے اور اگر الیکشن کرائے بھی تو مذاق کے طور پر، وہ صرف حکومت کرنے کا شوق رکھتے ہیں، کسی کو حقوق دینا نہیں چاہتے۔۔۔ ان کے دور میں کوئی سیاسی پارٹی باقی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے سب کو ختم کر کے رکھ دیا، اس کے علاوہ ان ہی کے دور میں تین ہزار سرکاری اور غیر سرکاری اشخاص کو جن میں عورتیں بھی تھیں جیل میں رکھا گیا۔ شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو جلا وطن کیا، کشمیر کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں جیسے سردار شاہ، مولوی محمد عبداللہ، شمیم احمد شمیم کے چچا جناب عبدالرحیم وغیرہ کا پاکستان کے ساتھ جنگی قیدیوں سے تبادلہ کیا۔"

(شبستان، مئی ۱۹۷۲ء)

250

قریشی صاحب ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور کا ذکر کر رہے ہیں، کہ جب کشمیر قبائلی حملے کی زد میں تھا اور ہندوستانی فوجیں اپنی جانوں پر کھیل کر کشمیر کو پاکستان کے چنگل سے بچانے کے لئے ایک فیصلہ کُن جنگ میں مصروف تھیں۔ لیکن انہوں نے جان بوجھ کر اِس پسِ منظر کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے، پورے انٹرویو میں ایک بار بھی کشمیر پر پاکستانی حملے اور شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیری عوام کی مدافعتی جنگ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اِن دنوں قریشی صاحب ریلوے میں نائب وزیر نہیں، ریاست میں کسی جگہ پر نائب

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

تحصیل دار تھے، اور ان ایام میں پاکستان اِن کے خوابوں کی جنت اور ان کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ قریشی صاحب یہ کیسے بتاتے، کہ جب شیخ صاحب اور اِن کے ساتھی کشمیر کو قبائلی درندوں کی بہیمیت سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کیئے ہوئے تھے تو اِس وقت قریشی صاحب اور ان کے ساتھی قبائلی حملہ آوروں کا استقبال کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے، ان میں یہ اخلاقی جرأت کہاں کہ وہ اِس بات کا اعتراف کریں کہ اگر اُس نازک دور میں شیخ صاحب کی مساعی جمیلہ کی بجائے قریشی صاحب کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں تو آج کشمیر ہندوستان کا حصہ ہونے کے بجائے پاکستان کے قبضے میں ہوتا۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں کئی بار اپنے گرفتار ہونے کا ذکر کیا ہے، لیکن انہوں نے اشارتاً بھی یہ بات نہیں کہی ہے کہ انہیں کِس جرم یا الزام کی پاداش میں نظر بند کیا گیا تھا، وہ شائد بھول گئے ہوں، اس لئے کہ ہر انسان اپنے شرمناک ماضی کو بھول جانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن افراد کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ تاریخ کا نہیں۔ میں انہیں یاد دلانا چاہوں گا کہ انہیں اس لئے گرفتار کیا گیا تھا کہ وہ اس وقت کشمیر میں پاکستانی ایجنٹ کے طور پر کام کرتے تھے، ان کی تمام تر سیاسی سرگرمیاں کشمیر کی عزت، سلامتی اور سالمیت کے لئے ایک زبردست خطرہ تھیں۔ وہ ۱۹۴۹ء ہی نہیں ۱۹۶۰ء تک کشمیر پولٹیکل کانفرنس کے نائب صدر تھے۔ یہ جماعت کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کو اپنا سیاسی نصب العین سمجھتی ہے۔ اور اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس جماعت کو پاکستان سے ہر سال لاکھوں روپیہ ملتا رہا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ ۱۹۶۹ء میں چراغ بیگ کے دورۂ پاکستان کے دوران پاکستان

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کے ہوم سیکریٹری نے اِسے یہ طعنہ دیا تھا کہ ''آپ کے وزیروں نے بھی ہمارا پیسہ کھایا ہے۔'' یہ اشارہ غالباً قریشی صاحب کی ہی طرف تھا!۔

رہی بات سردار شاہ، مولی محمد عبداللہ اور شمیم احمد شمیم کے چچا عبدالرحیم کو پاکستان بھیجنے کی تو چراغ بیگ یہ جاننا چاہے گا کہ قریشی صاحب اپنے اِن رفیقوں کے غم میں آنسو کیوں بہا رہے ہیں؟ کیا مرکزی وزارت کے نرم و نازک مسندوں پر بیٹھ کر بھی انہیں ''بیتے دنوں'' کی یاد آ رہی ہے۔ کیا دِل کے کسی کونے میں پھر ''پاکستان زندہ باد'' کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں؟۔ انہوں نے شمیم احمد شمیم کے چچا مولوی عبدالرحیم کی جلاوطنی کا ذکر کیا ہے، تو لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجئے، کہ ۱۹۶۹ء میں جب شمیم صاحب لاہور میں اپنے چچا مولوی عبدالرحیم سے ملے تو انہوں نے شیخ صاحب کے نام یہ پیغام دیا۔ ''ہم غلطی پر تھے، آپ نے جو کچھ کیا، وہ ٹھیک تھا۔'' اور جب شمیم صاحب نے اُنہیں یاد دلایا کہ شیخ صاحب نے انہیں جلاوطن کر دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ شیخ صاحب نے وہی کیا جو ایک عظیم محبِ وطن کو کرنا چاہئے تھا۔ اور ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں۔''

کیا فرماتے ہیں قریشی صاحب بیچ اِس مسئلے کے؟

قریشی صاحب نے اپنے انٹرویو میں کہیں کشمیر کی تحریک آزادی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اِس لئے کہ وہ کبھی اس تحریک کا حصہ نہ تھے، اِس کا ذکر کر کے وہ اپنے سیاسی وجود اپنی ڈپٹی منسٹری اور سری نگر میں حال ہی میں تعمیر شدہ اپنے ''لال قلعے'' کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے کشمیر کی تحریکِ آزادی کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔ وہ کشمیر کی تاریخ ۱۹۴۷ء

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے شروع کرتے ہیں کہ جب انہیں پاکستان نواز سرگرمیوں کی بناء پر گرفتار کیا گیا تھا اور اِسے ۱۹۷۱ء پر ختم کرتے ہیں۔ کہ جب انہیں مرکزی وزارت ریلوے میں نائب وزیر مقرر کیا گیا۔ میں اُنہیں یاد دِلانا چاہتا ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ ۱۹۴۷ء میں نہیں، بلکہ ۱۹۳۱ء میں کشمیر کے سیاسی اُفق پر طلوع ہوئے اِس وقت قریشی صاحب کی عمر اڑھائی برس سے زیادہ نہ تھی اور یہ وہ دور تھا، کہ جب قریشی صاحب کے والد حاجی محمد امین اپنے بیٹے کے نائب وزیر تو کیا نائب تحصیل دار ہونے کا بھی تصور نہ کر سکتے تھے، ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک شیخ صاحب اور ان کے رفقاء کی مسلسل جدو جہد اور بے مثال قربانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ کشمیر میں سیاسی بیداری اور انقلاب پیدا ہوا، جب حاجی محمد امین صاحب سرینگر سے راولپنڈی تک بسیں چلایا کرتے تھے، تو شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھی جیل خانوں میں اپنا لہو جلا کر حاجی صاحب کے بیٹے کے لئے ایک خوش آئند مستقبل کے سپنے دیکھا کرتے تھے، جب قریشی صاحب اپنی ماں کی گود میں اپنا انگوٹھا چوس رہے تھے تو شیخ صاحب کی قیادت میں کشمیر کے جیالے نوجوان اپنے سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے، اور جب قریشی صاحب گلی ڈنڈا کھیلنے لگے، تو شیخ صاحب اور ان کے ساتھی مہاراجہ ہری سنگھ کی سنگینوں سے کھیل رہے تھے، اور یہ سب کچھ ''حکومت کرنے کے شوق'' میں نہیں، کشمیر کو مطلق العنانیت اور شخصی راج کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے!! اگر شیخ صاحب بھی حاجی محمد امین کی طرح الائیڈ چراغ دین کی بسیں چلانے پر ہی اکتفا کرتے، تو آج محمد شفیع قریشی اپنے نام کے ساتھ ایم اے، ایل ایل بی کا دُم چھلہ لگانے کے قابل نہ ہوتے...... سری

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نگر سے جموں تک مسافروں کو لانے لے جانے کے کام میں مصروف ہوتے۔ شیخ صاحب کا کشمیر کے عوام پر ہی نہیں، آنے والی نسلوں اور اِس کی تقدیر پر بھی احسان ہے۔ اِن سے سیاسی اختلافات ہو سکتے ہیں، اِن کے نکتہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے تاریخی منصب، ان کی سیاسی عظمت اور کشمیری عوام سے ان کی والہانہ محبت میں شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کشمیر کو ایسا وقار بخشا ہے کہ جِسے ہزاروں محمد شفیع قریشی بھی نہیں چھین سکتے۔ قریشی صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب کو صرف حکومت کرنے کا شوق ہے۔'' دُنیا جانتی ہے۔ خود قریشی صاحب کا ضمیر جانتا ہے، کہ یہ الزام ایک بہت بڑا جھوٹ ہے اور جھوٹے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ شیخ صاحب کو حکومت کرنے کا شوق ہوتا تو وہ حکومت کو یوں حقارت سے ٹھکرا نہ دیتے، وہ آج بھی حکومت کرنے پر آمادہ ہو جائیں، تو محمد شفیع قریشی جیسے سینکڑوں وزیران کے تسمے باندھنے پر مامور ہو سکتے ہیں لیکن وہ حکومت نہیں، عزّت چاہتے ہیں۔ اور اپنے لئے نہیں کشمیر کے چالیس لاکھ عوام کے لئے۔ یہ عزّت وزارت ریلوے میں محرّر مال ہونے سے نہیں ضمیر اور ذہن کی آزادی سے نصیب ہوتی ہے، اور اِس نکتے کو قریشی صاحب جیسے ہوس کے بندے نہیں سمجھ سکتے۔ وہ نائب وزیر ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور نائب تحصیل دار ہی ہیں۔

قریشی صاحب نے جھوٹ اور افتراء کے اِس انبار میں، غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر حق و صداقت کی ایک چنگاری بھی چھوڑ دی ہے اور اِس چنگاری نے جھوٹ کے اِس قطب مینار کو راکھ بنا کر صرف اِس حقیقت کو واضح کر دیا ہے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کہ کشمیر میں جمہوریت کے نام پر کشمیری عوام کے ساتھ ایک بے رحم مذاق ہو رہا ہے۔

"شیخ صاحب اور بخشی صاحب کے زمانے میں کوئی بھی الیکشن ایمانداری اور انصاف کے ساتھ نہیں ہوا۔۔۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک شیخ صاحب وزیر اعلیٰ (اعظم؟) رہے۔ مگر وہ خود ایک بار بھی الیکشن نہیں لڑے۔ بخشی صاحب نے ۱۹۶۷ء میں پہلی بار الیکشن لڑا، ہر الیکشن میں اکثر اراکین بلا مقابلہ کامیاب ہو جاتے تھے۔ یہ مذاق نہیں تو کیا تھا؟۔۔۔ یہ دور صادق صاحب تک چلتا رہا، ان کے زمانے میں بھی نامزدگی کے زیادہ تر کاغذات بے ایمانی سے نامنظور کر دیے جاتے تھے۔"

(شبستان۔ مئی ۱۹۷۲ء)

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، ابھی تک حکومت ہند کا یہ موقف تھا کہ بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر قائم شدہ آئین ساز اسمبلی نے الحاق کی تصدیق کر لی ہے۔ اِس لئے اب رائے شماری کا نعرہ بے معنی ہے، لیکن آج مرکزی وزارت کے ایک نائب وزیر صاحب اِنکشاف فرماتے ہیں، کہ نہ صرف آئین ساز اسمبلی کے انتخابات فراڈ تھے۔ بلکہ ۱۹۶۷ء تک ریاست میں جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں، وہ ایمانداری اور اِنصاف کے ساتھ نہیں ہوئے، دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر موصوف نے ۱۹۶۷ء کے اِن انتخابات پر بھی حرف گیری کی ہے کہ جن میں وہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

خود بھی اننت ناگ کے ڈپٹی کمشنر عبدالخالق ملک کی مہربانی سے بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے، کیا فرماتی ہیں شریمتی اندرا گاندھی بیچ اس مسئلے کے۔ کہیں قریشی صاحب نے پھر اپنے پاکستانی آقاؤں کے ساتھ ناطہ تو نہیں جوڑا ہے؟ داناؤں کے لئے اشارہ کافی ہے۔۔۔

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

......☆......

(اگست، ۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اتھواجن کا مرغی خانہ

اتھواجن سرینگر سے تقریباً چار میل دور ایک گمنام سا گاؤں ہے۔ چند سال پہلے اس گاؤں میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی۔ کہ جس سے کسی کو اس کے محل وقوع یا حدودِ اربعہ سے کوئی دلچسپی ہوتی۔ پھر ایک دن شہر کے کچھ زرداروں اور بیرونِ شہر کے کچھ سرمایہ داروں نے اِس گاؤں کا ایک وسیع رقبہ خرید کر یہاں ایک بہت بڑا پولٹری فارم قائم کر دیا اور یہاں سے ہر روز سینکڑوں چوزے اور ہزاروں انڈے 'سول اور ملٹری' کو سپلائی ہونے لگے، اسطرح اتھواجن کچھ ہونہار، ذہین اور خوش بخت سرمایہ داروں کی پُرکاری سے عوام اور خواص دونوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور اب کچھ دنوں سے ہر شخص کی زبان پر اتھواجن پولٹری فارم کا نام ہے۔ کچھ لوگ اشاروں اور کنایوں میں، کچھ سرگوشیوں میں، کچھ کھل کر اور کچھ دبی زبان سے اتھواجن سکینڈل کی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک دو بار ریاستی اسمبلی میں بھی اتھواجن پولٹری فارم کی صدائے بازگشت سنائی دی، لیکن وزیر اعلیٰ سید میر قاسم اور وزیر زراعت مسٹر ترلوچن دت کی ''سازش'' نے اتھواجن کی ''سازش'' کو اچھی طرح بے نقاب ہونے سے بچا لیا ہے۔ چراغ بیگ نے اس سلسلے میں جو اعداد و شمار،

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

حقائق اور سرگوشیاں جمع کی ہیں، وہ قارئین ''آئینہ'' کی نظر ہیں، تا کہ وہ اپنے طور پر فیصلہ کر سکیں، کہ اتھواجن کے افسانے کی حقیقت کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ اتھواجن پولٹری فارم کو حکومت نے پرائیویٹ سیکٹر سے اٹھا کر پبلک سیکٹر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس فارم کو سرمایہ داروں سے خرید کر حکومت کی ملکیت بنانے کے احکامات جاری ہوئے ہیں۔ اب جس چیز نے اِس خرید و فروخت کو سکینڈل کا درجہ عطا کیا ہے۔ وہ ہے اس کی قیمت ایک پرائیویٹ اندازے کے مطابق اس فارم کی کل قیمت جس میں مرغ، مرغیاں، چوزے، انڈے، زمین اور مشین سب شامل ہے، اڑھائی تین لاکھ سے زیادہ نہیں۔ لیکن ریاستی حکومت نے ''چند خصوصی وجوہات'' کی بنا پر اڑھائی تین لاکھ کی اس چیز کیلئے ساڑھے نو لاکھ روپے ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ سب مول تول اس 'برق رفتاری' کے ساتھ طے ہوا ہے کہ حکومت کو یہ جاننے کی فرصت اور مہلت ہی نہ ملی، کہ جس فارم کیلئے وہ ساڑھے نو لاکھ روپے ادا کر رہی ہے، وہ بیکوقت تین بینکوں کے پاس رہن ہے، چراغ بیگ کو تو فوراً ہی معلوم ہو گیا، کہ خوش بخت سرمایہ داروں نے فارم میں اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی صرف نہیں کیا تھا بلکہ تین سرکاری بینکوں سے قرض لے کر یہ دکان چالو کی تھی۔ اور اس قرض کے عوض یہ ساری زمین اور جائداد ان تین بینکوں کے نام رہن کر دی تھی، لیکن سونے کے مول مٹی خریدنے والی حکومت کو ابھی تک اس کا کوئی ''علم'' نہیں ہے۔ اس تغافل یا تجاہل عارفانہ کی بھی کئی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اتھواجن پولٹری فارم کے مالکوں میں بڑے بڑے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سیاسی مرغ، مرغیاں، سماجی چوزے اور صحافتی انڈے شامل ہیں اور ریاستی حکومت اتھواجن پولٹری فارم کیلئے نہیں، بلکہ اس سیاسی، سماجی اور صحافتی مرغی خانے کیلئے اتنی بڑی قیمت ادا کر رہی ہے۔ ملاحظہ ہوں اسمائے گرامی ان خوش نصیبوں چوزہ فروشوں کے کہ جن کے نام اتھواجن لاٹری کا پہلا انعام نکل آیا ہے۔

۱۔ شری دُرگا پرشاد در مرکزی وزیر منصوبہ بندی (زبان پر بار خدایا یہ کس کا نام آیا)

۲۔ وجے کمار در فرزند دُرگا پرشاد در

۳۔ لالہ تیرتھ رام ممبر پارلیمنٹ۔ شری ملیگاوانکر ایڈیٹر انڈین ایکسپریس۔

۴۔ مسز وجے کمار در جو لالہ تیرتھ رام کی دختر نیک اختر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آدھا درجن کے قریب نام ہیں، جو ڈی، پی صاحب اور لالہ صاحب کے رشتے دار ہیں۔ چوزہ فروشوں کے یہ نام اسلیئے اہمیت رکھتے ہیں، کہ سرگوشیاں کرنے والوں کے خیال میں اتھواجن فارم کو سرکاری ملکیت میں لیئے جانے کا فیصلہ ڈی، پی صاحب کے اشارے پر ہوا ہے یا ان کو بدنام کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔ چراغ بیگ ڈی، پی صاحب کو اچھی طرح سے جانتا ہے، ان میں بہت سی کمزوریاں ہیں، لیکن پیسہ ان کی کمزوری نہیں۔ اور خدا کے فضل سے پیسے کی ان کے پاس کوئی کمی بھی نہیں، وہ اشارہ کریں تو لاکھوں نہیں، کروڑوں روپے ان کے قدموں پر نچھاور ہو جائیں گے، پھر وہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے کے لئے ایسا گھٹیا سودا کرنے پر کیوں آمادہ ہوئے (ان کے حصے میں زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم تو آئے گی) میں یہ نہیں مان سکتا، کہ ہندوستانی کابینہ کے سب سے اہم وزیر، مسز اندرا گاندھی کا خصوصی مشیر، روس اور ہندوستان کے درمیان دوستی اور تجارت کا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

معاہدہ طے کرنے والا سفیر عالمی اور ملکی سیاست کی بلندیوں سے اتھواجن پولٹری فارم کی پستیوں کو چھونے کی کوشش کریگا، ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے کسی عزیز رشتے دار نے ان کا نام استعمال کیا ہو، ہوسکتا ہے کہ ان کے کچھ نادان دوستوں نے انہیں خوش کرنے کیلئے ان سے پوچھے بغیر یہ مہربانی کی ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ ان کے کچھ دشمنوں نے ان کو ذلیل اور بدنام کرنے کیلئے ان کے چہرے پر اتھواجن کی کالک ملنے کی کوشش کی ہو؟ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ڈی، پی، صاحب نے اپنے عزیز و اقارب کے دباؤ میں آکر مصلحت آمیز خاموشی اختیار کی ہو۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو، بہت ہی ناگوار اور تلخ ہے۔ اگر یہ سب کچھ ڈی، پی صاحب کے ایماء سے ہوا ہے تو غلط اور اگر ان کی علمیت یا مرضی کے بغیر ہوا ہو تو غلط! دونوں صورتوں میں، میں اِس بات کا قائل ہوگیا، کہ دوست احباب اور عزیز و اقارب انسان کو شہرت اور عظمت کی بلندیوں سے زمین کی گہرائیوں تک کھینچ لانے میں سب سے اہم اور نمایاں رول ادا کرتے ہیں! ریاستی حکومت پولٹری کی صنعت کو پرائیویٹ سیکٹر میں بڑھاوا دینے کیلئے ہر سال لاکھوں روپے کے قرضے دیتی ہے تو پھر اس چالو پولٹری فارم کو اتنی بھاری قیمت پر خریدنے کو کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ کیا یہ صحیح ہے کہ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے ایک نہیں دو بار اس تجویز کو رد کر دیا تھا؟ پھر وہ کون سی طاقت تھی، کہ جس نے انہیں اپنی مرضی کیخلاف یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا؟ کچھ لوگ کہتے ہیں، کہ مسز گاندھی نے ٹیلی فون پر حکم دیا۔ میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں!

(۱۹۷۲ء) ......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ایڈیٹر کی ڈائری

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جنگی قیدی - دردِ سر !

پاکستان کے ۹۳ ہزار جنگی قیدی جو کچھ عرصہ قبل صدر بھٹو کے لئے دردِ جگر کا باعث تھے اب ہمارے لئے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ شملہ کی چوٹی کانفرنس تک ہم اِس خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ پاکستان اِن قیدیوں کو رہا کرانے کے لئے ہر ممکن قیمت ادا کرنے کو تیار ہوگا۔ لیکن شملہ کی بات چیت کے دوران ہمارا یہ قیاس غلط ثابت ہوا اور پاکستانی صدر اور وفد کے دوسرے اراکین نے جنگی قیدیوں کی بجائے مفتوحہ علاقے کی واپسی پر زور دیا۔ اب جبکہ سرحدوں کی نشاندہی کے متعلق دونوں ملکوں کے کمانڈروں میں اتفاقِ رائے ہونے میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے، جنگی قیدیوں کی واپسی کا معاملہ اور زیادہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے اور مستقبل قریب میں اِن کے بارے میں کسی تصفیئے کا امکان نظر نہیں آتا۔ یہ صورتِ حال ہمارے لئے بہت خوش کُن اور حوصلہ افزا نہیں ہے اور ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کا یوں ہمارے گلے پڑ جانا ہماری عزت اور شہرت کا باعث نہیں بن رہا ہے غیر ممالک میں ہم سے ہمدردی رکھنے والے دوست بھی جنگی قیدیوں کی واپسی میں اِس غیر معمولی تاخیر کے لئے ہمیں دوش دے رہے ہیں اور بنگلہ دیش کی جنگِ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

آزادی کے دوران ۸۰ لاکھ پناہ گزینوں کو اپنے ملک میں جگہ دیکر ہم نے ساری دُنیا میں جو عزّت اور نیک نامی حاصل کی تھی، وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ اور ہم مہذب دُنیا کی نگاہوں میں مجرم بنتے جارہے ہیں۔ جنیوا کنونشن کی رُو سے جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے تقریباً ایک سال بعد بھی پاکستان کے ۹۳ ہزار جنگی قیدی ہماری تحویل میں ہیں۔ اور اِس طرح ہم واضح طور جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اور دِلچسپ بات یہ ہے کہ ہم نہ صرف اِس کنونشن میں شریک تھے بلکہ اِس پر دستخط کرنے والوں میں سب سے پیش پیش تھے۔ جنگی قیدیوں کی واپسی میں اِس غیر معمولی تاخیر نے کچھ اور مسائل بھی پیدا کر دیئے ہیں جو ہمارے لئے باعث تکلیف اور تشویش بن گئے ہیں ۹۳ ہزار افراد کی نگہداشت، خرد و نوش، علاج و معالجہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں، پچھلے ۹ ماہ کے دوران ہم اِن ضروریات پر پانچ کروڑ سے زیادہ رقم صرف کر چکے ہیں۔ اور اس پر طُرّہ یہ کہ آئے دن کسی نہ کسی کیمپ میں گولی چلتی ہے۔ اور ابھی تک ایک درجن کے قریب جنگی قیدی مارے گئے ہیں۔

ان واقعات اور حادثات نے ہماری شہرت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور عالمی رائے عامہ روز بروز ہمارے خلاف ہوتی جارہی ہے۔ خود ہندوستان میں بہت سے باضمیر اور حساس لوگ اِس صورتِ حال سے سخت نالاں ہیں اور وہ حکومت ہند پر زور دے رہے ہیں کہ وہ جنگی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر کے اپنی بچی کھچی عزت اور شہرت کو بچائے۔ دیکھئے مسز اِندرا گاندھی پر اِن کوششوں کا کیا اثر ہوتا ہے اور وہ عالمی رائے عامہ کا کس حد تک احترام کرتی ہیں۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ایشیاء۷۲ء

"ایشیاء۷۲ء" کے میلے کی شہرت اتنی زیادہ ہے کہ اِسے دیکھ کر آدمی قدرے مایوس ہو جاتا ہے میلہ دیکھنے والوں کی زیادہ تعداد اِن عام لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے، کہ جو علمِ سے زیادہ تفریح اور معلومات سے زیادہ دِل بہلائی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن "ایشیاء۷۲ء" میں یہی دو چیزیں ناپید ہیں۔ نہ بچوں کی تفریح کا کوئی سامان ہے اور نہ بڑوں کی دِل بہلائی کا کوئی ذریعہ، بس نمائش کے ایک سرے سے دوسرے سِرے تک چلتے رہئے، اور چلتے چلتے دُنیا بھر کی صنعتی ترقی کا اندازہ کیجئے۔ غیر ممالک کے پیویلینز میں زیادہ تر بڑی بڑی مشینیں اور تجارتی قسم کا ساز و سامان سجا ہوا ہے۔ اور اِن سے عام آدمی کو زیادہ دلچسپی نہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ خلاف توقع نمائش وہ رش نہیں لے رہی ہے، کہ جس کا منتظمین کو اندازہ تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ پہلی مرتبہ کشمیر کا پیویلین جاذبِ نظر اور باعثِ کشش ہونے کے علاوہ کشمیر کی صنعتی ترقی کی بھرپور نمائندگی بھی کرتا ہے۔

تین ہاؤس بوٹوں میں سجا ہوا یہ پیویلین نمائش دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور اس کا شمار آسانی کے ساتھ نمائش کے چند خوبصورت ترین پیویلینز میں کیا

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جاسکتا ہے۔ صرف دو باتیں مجھے کچھ معیوب سی لگیں، ایک اندر داخل ہونے سے پہلے گیٹ پر وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کی وہ تصویر، کہ جس میں وہ وزیر اعلیٰ کی بجائے پولیس انسپکٹر لگتے ہیں۔ وویمن گرل گائیڈس کا انتخاب، آٹھ لڑکیوں میں صرف دو ریاست سے تعلق رکھتی ہیں اور باقی چھ نہ معلوم کہاں سے ٹپکی ہیں؟

......☆......

(۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شیخ صاحب کے شب و روز

شیخ صاحب ۱۳ر نومبر کو دلّی پہنچ کر اسی شام آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں داخل ہوگئے، جہاں اِس وقت ان کا طِبی معائینہ ہو رہا ہے۔ انسٹی چیوٹ جانے سے پہلے وہ اپنے پُرانے دوست مسٹر جے سنگھ جو ایک عرصے سے صاحب فراش ہیں کی عیادت کو گئے۔ شیخ صاحب کا کہنا ہے کہ مسٹر سنگھ اب چراغِ سحری ہیں اور وہ کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ خود شیخ صاحب کو ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے اور اندازہ ہے کہ طِبی معائینہ کرنے میں کم سے کم پندرہ دِن لگیں گے۔ ان کے کمرے کے باہر VISITORS NOT ALLOWED کا بہت بڑا بورڈ آویزاں کر دیا گیا ہے، لیکن شایئد ہی کوئی لمحہ ہو، کہ جب اِن کے ہاں کوئی نہ کوئی وزیٹر موجود نہ رہتا ہو، شیخ صاحب نے مِسز گاندھی کو کشمیری سیب اور زعفران کے پھول بھیجے تھے اور وزیراعظم نے اِس تحفے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شیخ صاحب کے نام ایک خط میں لکھا ہے، کہ زعفران کے پھولوں سے بہت سے پُرانی یادیں تازہ ہوگئی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے ذاتی معالج مسٹر ماتھر کو ہدایت کی ہے، کہ وہ بھی شیخ صاحب کی دیکھ بھال کریں،

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

منصوبہ بندی کے مرکزی وزیر مسٹر ڈی، پی در نے پہلے پھولوں کا گُلدستہ بھیجا تھا اور پھر ایک قاصد بھیجا دیا۔ اس طرح آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ کے کمرہ ۲۰۱ میں صبح سے شام تک خاصی رونق لگی رہتی ہے، ساتھ والے کمرے میں میر غلام رسول (سابق چیف انجینئر) بھی اپنا طبی معائنہ کروا رہے ہیں۔

......☆......

(۱۹۷۲ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

پروفیسر مدھوک کی خانہ ساز تاریخ

جن سنگھ کے پروفیسر بلراج مدھوک کے حق میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ بہت صاف گو، منہ پھٹ اور مستقل مزاج آدمی ہیں، ہر بات بغیر لگی لپٹی کے کہتے ہیں، اور جو بات ایک مرتبہ ان کی زبان سے نکل آجائے، اسے حرف آخر سمجھتے ہیں، وہ اٹل بہاری باجپائی اور دوسرے جن سنگھی لیڈروں کی طرح زہر میں شکر ملانے کے یا تو اہل نہیں ہیں یا قائل نہیں ہیں، وہ اپنے من کی سیاہی کو تہذیب اور شائستگی کے پردوں میں چھپانے پر قادر نہیں ہیں۔ اور اِسی لئے دِل کی بات زبان پر لائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے، وہ ہیں تو تاریخ کے اُستاد، لیکن میں انہیں تاریکی کا اُستاد سمجھتا ہوں۔ تعصب، جہالت اور فرقہ پرستی میں جماعتِ اسلامی کا کوئی مولوی ہی ان کا مقابلہ کرسکتا ہے!

مدھوک صاحب کے ساتھ مجھے پچھلے دو سال کے دوران کئی مجلس مباحث میں شریک ہونے کا موقع مِلا ہے۔ اور کشمیر کے معاملے پر میری ہر بار اِن سے جھڑپ ہو جاتی ہے۔ اِس لئے نہیں کہ کشمیر کے متعلق اِن کے اور میرے نظریات میں شدید اختلاف ہے، بلکہ اِس لئے کہ اُنہوں نے اپنے نظریات اور اعتقادات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک ''سپیشل تاریخ'' گھڑی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہے کہ جس کا اصل واقعات اور حقائق کے ساتھ قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور بدقسمتی سے اپنی 'مخصوص تاریخ'' کے ہر واقعے کو وہ صیغۂ واحد متکلم FIRST PERSON SINGULAR میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً اِن کا دعویٰ ہے، کہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر کو پاکستان حملہ آوروں سے بچانے کا سہرا نہ شیخ عبداللہ کے سر ہے اور نہ ہندوستانی فوج کے، بلکہ خود پروفیسر مدھوک اور گیان چند بالی کے (یہ بالی صاحب کون ہیں۔کوئی نہیں جانتا) ان کی تاریخ کی رُو سے شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۴۷ء میں غلام محمد صادق کو مسٹر محمد علی جناح کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا تھا۔ کہ اگر تم مجھے کشمیر کا پرائم منسٹر بنا دو، تو میں کشمیر کو پاکستان کے ساتھ مِلانے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اِس بات پر بضد ہیں کہ مونٹ بیٹن پلان کی رُو سے کسی ریاست کو آزاد یا خودمختار رہنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ اس طرح کی لامعنی اور فضول باتوں کی حقیقت کا درجہ دے کر پھر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کشمیر کے دستاویزِ الحاق پر چونکہ مہاراجہ نے اپنے دستخط ثبت کر دیئے تھے۔ اِس لئے کشمیری عوام کو ہرگز ہرگز یہ حقِ نہیں پہونچتا کہ وہ حقِ خودارادیت کا مطالبہ کریں۔ جب انہیں یہ یاد دِلایا جاتا ہے کہ مہاراجہ سے بھی بڑی چیز یعنیٰ ہندوستانی حکومت نے ریاستی عوام کے اِس حق کو تسلیم کیا ہے تو وہ کوئی معقول جواب دینے کی بجائے یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی گورنر جنرل اور وزیراعظم کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ چند ماہ قبل پنچ گئی (پونا) میں ایک سیمنار میں حصّہ لیتے ہوئے میں نے کشمیر کے سوال پر جو تقریر کی تھی، اِس کی ایک مختصر سی رپورٹ ممبئی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفتہ روزہ 'ہمت' میں ہوئی ہے۔ اِس سیمنار میں پروفیسر مدھوک بھی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

شامل تھے اور اُنہوں نے سیمنار میں ہی میری تقریر کے جواب مین اپنی 'نادر تاریخ' کے کچھ باب دُہرائے تھے "ہمت" کے اِس شمارے میں بھی میری تقریر کے ساتھ ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں اُنہوں نے کشمیر کو آئینی قانونی اور اخلاقی لحاظ سے ہندوستان کا ناقابلِ تسخیر حصّہ قرار دینے کے بعد اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کشمیری مسلمانوں، کی اکثریت پاکستان کے حق میں ہے۔ اس تکلیف دِہ اعتراف کے بعد اُنہوں نے مسز اِندرا گاندھی کے سامنے یہ تجویز رکھا ہے کہ "اگر کشمیر کے سوال پر پاکستان اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہو، اور مسز گاندھی پاکستان کیساتھ ہر قیمت پر سمجھوتہ کرنا چاہتی ہوں، تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کر کے اِس کے بدلے میں پاکستان سے تھار پارکر (سندھ) جس میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اور پسرور ظفروال، نارا وال اور چکنز نک کا سارا پہاڑی سلسلہ حاصل کرے" یعنی پاکستان یہ علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دے، تو پھر پروفیسر مدھوک کو کشمیر کے پاکستان کے ساتھ ملائے جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ اِس لین دین کے بعد ہندوستان کی علاقائی سالمیت اِس کی آئینی اور قانونی پوزیشن اور کشمیری عوام کا وجود سب کُچھ پروفیسر صاحب کے لئے غیر متعلق بن جاتا ہے اِسے کہتے ہیں بنیوں کی سیاست اور بدقسمتی سے ہندوستان میں پروفیسر مدھوک جیسے بنیوں کی تعداد کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مدھوک صاحب جو سوچتے ہیں وہ کہتے ہیں، دوسرے لوگ صرف سوچتے ہیں، زبان سے کہتے نہیں۔

(۱۹۷۲ء)

......☆......

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مرکزی حکومت صرف تشدد' توڑ پھوڑ اور تخریب کی زبان سمجھتی ہے

کشمیری عوام کی نا آسودگی اور بے اطمینانی کو اس لئے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے کہ یہاں تشدد اور توڑ پھوڑ کی کاروائی نہیں ہوتی

شیخ محمد عبداللہ سے براہ راست بات چیت شروع کی جائے، شمیم احمد شمیم کا وزیراعظم کو مشورہ، صدر جمہوریہ کے خطبے پر تقریر

آیئے صدر کی اُس تقریر کے لئے اُس کا شکریہ ادا کریں' کہ جو کچھ سرکاری ملازموں نے لکھی ہے، چند مطلق العنان حاکموں نے پسند کی ہے۔ اور جس پر جی حضوری کی ایک بہت بڑی تعداد تالیاں بجارہی ہے صدر نے جس جوش اور ولولے سے اِس تقریر کو پڑھا ہے، اِس کے لئے انہیں مبارکباد ملنی ہی چاہئے۔

صدر کے نام سے لکھے گئے اِس خطبے میں دُنیا بھر کے مسائل کا ذکر ہے، لیکن ہماری سیاسی اور سماجی زندگی کو درپیش سب سے نازک ترین مسائل کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ بھی نہیں۔ اِس خطبے میں کہیں یہ سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں ہوئی ہے کہ آج پُورے ملک میں تشدد اور تباہی کا ماحول کیوں قائم ہوا ہے۔ صدر نے آندھرا کے لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین ضرور کی ہے لیکن آندھرا میں تشدد کے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

لیڈروں کو بات چیت کے لئے دعوت نامے پر دعوت نامہ بھیج رہے ہیں، یعنی جب تک امن کی زبان استعمال کرو، کوئی نہیں سُنے گا۔ تشدد کی زبان بولو، سب سمجھنے لگ جائیں گے۔ اِس سلسلے میں اپنی ریاست جموں وکشمیر کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کشمیر کے متعلق حکومت، پریس، بلکہ حزب مخالف کے درمیان خاموشی کی ایک سازش چل رہی ہے، وہاں کے مسائل اور وہاں کی صورتِ حال کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا، اور اِس کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ وہاں کسی قسم کا تشدد یا توڑ پھوڑ کی کاروائی نہیں ہورہی ہے، یہ رُجحان کِتنا خطرناک ہے اِس کا اندازہ آپ کو بخوبی کر سکتے ہیں، پچھلے ایک سال سے کشمیر کی صورتِ حال میں ایک نہایت ہی خوشگوار اور حوصلہ افزا تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ایسی تبدیلی کہ جس کا ہمیں فوراً ہی خیر مقدم کرنا چاہئے تھا۔ کشمیر کے سب سے بڑے لیڈر اور وہاں کی مستند آواز شیخ محمد عبداللہ نے الحاق کی حقیقت کو تسلیم کر کے یہ بات صاف کردی ہے کہ وہ ہندوستانی آئین کی رو سے دی گئی اندرونی خودمختاری کی بحالی چاہتے ہیں، وہاں کی محاذ رائے شماری کے صدر میرزا محمد افضل بیگ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان اِس مسئلے میں کوئی فریق نہیں اور ہمارا جھگڑا صرف مرکزی حکومت سے ہے، اِن واضح اور حوصلہ افزاء اعلانات کے بعد مرکزی حکومت کا ردِ عمل کیا رہا ہے؟ کچھ نہیں، شیخ محمد عبداللہ سے ملاقات کے بعد مسز گاندھی نے کہا کہ ہم کشمیر کے بارے میں ایک نیا باب شروع کریں گے لیکن افسوس کہ یہ باب ابھی تک خالی پڑا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ یا ان کے ساتھ تشدد اور توڑ پھوڑ کی کاروائی کی دھمکی نہیں دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں حکومتِ ہند کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ کشمیر میں تشدد یا تخریب کی کاروائی نہیں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اسباب اور اِس پے چیدہ مسئلے کو سلجھانے کی طرف، کسی قسم کی نشان دہی کرنے سے گریز کیا ہے۔ آندھرا میں اِس وقت جو تشدد اور تباہی ہو رہی ہے اس پر یقیناً کوئی محبِ وطن، ذی ہوش ہندوستانی خوش نہیں ہو سکتا۔ لیکن آندھرا تو علامت ہے اصل مرض تو پُورے ملک میں پھیلا ہوا ہے، اور میں سمجھتا ہوں، کہ ملک میں تشدد، توڑ پھوڑ اور تخریب کی یہ فضا پیدا کرنے کی ذمہ داری اگر صرف ایک جماعت یا ایجنسی پر رکھی جا سکتی ہے، تو اِس کا نام حکومت ہند ہے، حکومت کا تمام تر رویّہ اِس بات کی شہادت ہے، کہ یہ حکومت تشدّد اور توڑ پھوڑ کے علاوہ اور کوئی زبان سمجھتی ہی نہیں ہے جب تک ریل کی پٹڑیاں نہ اُکھیڑی جائیں، کچھ عمارتوں کو نذر آتش نہ کیا جائے، بسوں اور دوسری سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ حکومت کوئی بات، کوئی مطالبہ سننے کے لئے رضامند نہیں ہوتی، چاہیے وہ مطالبہ کتنا ہی معقول اور جائز کیوں نہ ہو۔ آندھرا کی مِثال لیجئے وہاں تلنگانہ اور آندھرا کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ انہوں نے شروع میں نہایت نرمی اور معقولیت کے ساتھ مرکزی سرکار کے سامنے اپنا مطالبہ رکھا۔ لیکن مِسز گاندھی اور اِن کے رفقاء نے امن اور معقولیت کی یہ زبان سمجھنے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آندھرا اور تلنگانہ کو علیٰحدہ کرنے کا مطالبہ وہاں کے کُچھ مفادِ خصوصی کر رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ پھر آندھرا کے لوگوں نے وہی زبان استعمال کرنا شروع کی کہ جو مِسز گاندھی اور ان کی حکومت اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ ریل کی پٹریاں اُکھڑنا شروع ہو گئیں۔ بسیں اور عمارتیں جلنا شروع ہو گئیں۔ اور پولیس کو لاٹھیاں اور گولیاں چلا کر لوگوں کے سینے چھلنی کرنا پڑے۔ اب مِسز گاندھی اور ان کے رُفقاء مسٹر سُیا رنڈی اور دوسرے علیٰحدگی پسند

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

لیڈروں کو بات چیت کے لئے دعوت نامے پر دعوت نامہ بھیج رہے ہیں، یعنی جب تک امن کی زبان استعمال کرو، کوئی نہیں سُنے گا۔ تشدد کی زبان بولو، سب سمجھنے لگ جائیں گے۔ اِس سلسلے میں اپنی ریاست جموں وکشمیر کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ کشمیر کے متعلق حکومت، پریس، بلکہ حزب مخالف کے درمیان خاموشی کی ایک سازش چل رہی ہے، وہاں کے مسائل اور وہاں کی صورتِ حال کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا، اور اِس کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ وہاں کسی قسم کا تشدد یا توڑ پھوڑ کی کاروائی نہیں ہو رہی ہے، یہ رُجحان کِتنا خطرناک ہے اِس کا اندازہ آپ کو بخوبی کر سکتے ہیں، پچھلے ایک سال سے کشمیر کی صورتِ حال میں ایک نہایت ہی خوشگوار اور حوصلہ افزا تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ایسی تبدیلی کہ جس کا ہمیں فوراً ہی خیر مقدم کرنا چاہیئے تھا۔ کشمیر کے سب سے بڑے لیڈر اور وہاں کی مستند آواز شیخ محمد عبداللہ نے الحاق کی حقیقت کو تسلیم کر کے یہ بات صاف کر دی ہے کہ وہ ہندوستانی آئین کی رو سے دی گئی اندرونی خود مختاری کی بحالی چاہتے ہیں، وہاں کی محاذ رائے شماری کے صدر میرزا محمد افضل بیگ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان اِس مسئلے میں کوئی فریق نہیں اور ہمارا جھگڑا صرف مرکزی حکومت سے ہے، اِن واضح اور حوصلہ افزاء اعلانات کے بعد مرکزی حکومت کا ردِ عمل کیا رہا ہے؟ کچھ نہیں، شیخ محمد عبداللہ سے ملاقات کے بعد مسز گاندھی نے کہا کہ ہم کشمیر کے بارے میں ایک نیا باب شروع کریں گے لیکن افسوس کہ یہ باب ابھی تک خالی پڑا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ یا ان کے ساتھ تشدد اور توڑ پھوڑ کی کاروائی کی دھمکی نہیں دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں حکومتِ ہند کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ کشمیر میں تشدد یا تخریب کی کاروائی نہیں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہو رہی ہے، اِس لئے کشمیری لیڈروں کی معقول بات سُننے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ آخر مسز گاندھی نے معاہدہ شملہ میں کشمیر کے سوال کو حتمی طور حل کرنے کا عہد کیا ہے۔ تو ان کے ذہن میں اِس حتمی حل کا تصوّر کیا ہے؟ معاہدہ شملہ میں کشمیر کے ذکر پر جن سنگھ نے بڑا واویلا کیا تھا، لیکن ہم نے اِس یقین دہانی کا خیر مقدم کیا تھا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اِس حتمی حل سے مراد کشمیر کے مقتدر اور مستند لیڈروں سے مفاہمت تھی، دُنیا جانتی ہے کہ کشمیر کے لوگ سیاسی طور نا آسودہ اور غیر مطمئن ہیں، اور انہیں ابھی تک جمہوری زندگی میں برابر کا حصہ ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن مرکزی حکومت نے جس سرد مہری اور بے التفاتی سے کشمیر کے عظیم رہنما شیخ محمد عبداللہ کو نظر انداز کیا ہے۔ اِس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کشمیری عوام کی بے چینی اور بے قراری کا صحیح احساس نہیں، ایک عرصے سے میرزا محمد افضل بیگ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر پارتھا سارتھی کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے۔ میں مسٹر پارتھا سارتھی کی بڑی عزّت کرتا ہوں لیکن ایک غیر سیاسی وائس چانسلر ایک سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں کیا کر سکتا ہے۔ یہ مسئلہ غیر معمولی سیاسی اہمیت کا ہے اور وزیر اعظم کو چاہیئے کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو شیخ صاحب یا میرزا افضل بیگ کا ٹیوٹوریل کلاس لینے کی بجائے براہِ راست شیخ محمد عبداللہ سے بات چیت کا آغاز کرنے کو کہیں، تا کہ اِس مسئلے کو جلد سے جلد حل کرنے کے امکانات تلاش کئے جا سکیں۔ اگر مرکزی حکومت کے رہنما اِس انتظار میں ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ کب تک زندہ رہیں گے۔ اس لئے فی الحال ٹال جاؤ اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کرو، تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت غلط طریقے پر سوچ رہے ہیں۔ شیخ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

محمد عبداللہ نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ وہ گاندھی، نہرو اور سیکولرازم کی زبان سمجھتے ہیں۔ اِن کے بعد جو نسل آئے گی، وہ نہ گاندھی کے نام سے آشنا ہوگی اور نہ جواہر لال نہرو کی ذات سے، وہ نہ ہندوستانی سیکولرازم کی زبان سمجھیں گے اور نہ جمہوریت کے آداب، اِس لئے مفاہمت بات چیت اور تعاون کے لئے سب سے موزوں شخصیت شیخ محمد عبداللہ کی ہے۔

کشمیری عوام ہندوستان کی سرد مہری بے اعتنائی اور مغرورانہ روّیے کا بغور مطالعہ کرر ہے ہیں، اور باوجود اِس کے کہ لوگ تشدّد اور توڑ پھوڑ کی کاروائی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی، لوگوں کی بے چینی اور ان کی ناآسودگی کسی بھی مرحلے پر ضبط اور توازن کے بندھ توڑ سکتی ہے۔ میں اِس ایوان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ظاہری سطح پر کشمیر کی صورتِ حال پُر امن ہو تو ہو، لیکن اِس پُر امن سطح کے نیچے ایک خطرناک بے چینی پرورش پا رہی ہے۔ جموں اور کشمیر کے درمیان علاقائی اور تہذیبی کھچاؤ پیدا کرنے کے لئے کچھ لوگ ایک عرصے سے کام کرر ہے ہیں۔ اور اگر چہ ابھی تک اِس کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں کہ آندھرا اور تلنگانہ کی طرح جموں اور کشمیر کے لوگ بھی ایک دوسرے سے علیٰحیدہ ہونے کے بارے میں سوچیں گے۔ مسز گاندھی کی کابینہ کے ایک اہم رُکن ڈاکٹر کرن سنگھ بہت پہلے اِس سلسلے میں اپنے خیالات واضح کر چکے ہیں۔

میں ایک بار پھر اس امر کی صراحت کرنا چاہوں گا کہ کشمیر کی اُلجھن کو حل کرنے کیلئے اِس وقت جیسا موقع ہاتھ آیا ہے وہ شائد دوبارہ نہ آئے۔ اس لئے اِسے کھو دینا مناسب نہ ہوگا۔ اگر مسز گاندھی صرف ریلوے کی پٹڑیوں کو اکھاڑنے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

یا ریل کے ڈبے جلانے سے ہی مسئلے کی اہمیت کو سمجھ سکتی ہیں، تو بد قسمتی سے ہم کچھ عرصے کے لئے ابھی یہ زبان استعمال نہیں کر سکتے، کیونکہ کشمیر میں ابھی تک ریل کی پٹڑی نہیں بچھی ہے۔ کیا ہی مناسب ہوتا کہ وہ اِس معاملے میں بھی اُسی جرأت اور ہمت سے کام لیتی، کہ جس نے انہیں بہت سے پے چیدہ مسائل کو حل کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ میں توقع رکھوں گا کہ وہ کشمیری لیڈروں سے موجودہ بات چیت کو وائس چانسلر کی سطح سے اُٹھا کر وزیر اعظم کی سطح پر لے آئیں گی۔

میں اس موقعہ پر ریاست کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ریاست کے سیاسی ماحول سے تناؤ اور کھچاؤ کم کرنے کے لئے کچھ جرأت مندانہ اقدامات کئے ہیں۔ ریاست کی تاریخ میں پہلی بار میونسپل کمیٹیوں کے لئے آزادانہ انتخابات منعقد کئے گئے ہیں اور اِس طرح عام لوگوں کو جمہوری زندگی میں شرکت کا موقع مِلا ہے۔ میں اُمید رکھتا ہوں کہ میونسپل انتخابات کے تجربے کو آگے بڑھا کر آئندہ اسمبلی کیلئے بھی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہوں گے اور پھر اِس تجربہ کو وسیع کر کے پارلیمانی انتخابات پر بھی لاگو کیا جائے گا۔ اگر خدا نخواستہ اسمبلی اور پارلیمانی انتخابات کے دوران پرانی ہی روش کو قائم رکھا گیا تو کشمیر کے لوگ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جمہوریت کا قافلہ پٹھانکوٹ سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جمہوری اداروں اور اقدار پر عوام کے اعتماد ختم ہو جانے سے ملک کی سالمیت اور وحدت بھی خطرے میں پڑ جائے گی اور اِس کا مستقبل بھی۔

......☆......

(۱۵ / مارچ ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

مولوی نور الدّین کا معمہ

مولوی نور الدین کی ذات بہت سے لوگوں کے لئے ایک پُر اسرار معمہ بنی ہوئی ہے۔ پچھلے سال کے آغاز میں جس طرح وہ پردۂ غیب سے ظہور میں آئے تھے، اسی طرح وہ نہایت پُر اسرار حالات میں غائب بھی ہوگئے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق وہ ایک بار پھر پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ مولوی صاحب یہاں کیوں آئے تھے، کس کی شہ پر آئے تھے اور کئی ماہ تک یہاں کیا کرتے رہے، صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ یہاں ڈی پی صاحب، قاسم صاحب اور دوسرے اعلیٰ مرکزی لیڈروں کے علاوہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب سے بھی ملتے رہے۔ بہت دنوں تک یہ افواہ اُڑتی رہی کہ وہ شیخ صاحب اور مرکزی حکومت کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ وہ کس کے ایماء پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟ اس سوال کا کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ یہاں جو لوگ اِن سے ملے، ان کا تاثر یہ تھا کہ مولوی صاحب پاکستان سے ناراض ہیں، اور وہ کشمیر کو ہندوستان ہی کا حصہ بنے رہنے کے حق میں ہیں، اعلیٰ ہندوستانی حاکموں اور ریاستی حکومت

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

سے اِن کے گہرے رابطے سے کم از کم یہی ظاہر ہوتا تھا۔ پھر وہ یک لخت غائب ہو گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں، اور پھر وہیں سے اُنہوں نے پاکستان کی راہ اختیار کی اور آج کل وہ پاکستان میں ہیں۔ وہاں سے آمدہ اطلاعات کے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بھی ان کی ذات اور سرگرمیاں اکثر لوگوں کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کے مخالفین انہیں ہندوستانی ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود پاکستانی حکومت نے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی ہے۔ کیا مولانا فاروق صاحب مولوی صاحب کی پُراسرار شخصیت کی نقاب کشائی کرنے میں ہماری کوئی مدد کر سکیں گے؟

......☆......

(۱۵/مارچ ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

حوصلہ افزا اور باعثِ اطمینان

یہ بات باعثِ اطمینان بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی کہ ۲۶/سال کی سرد مہری اور بے التفاتی کے بعد مرکزی حکومت کو اُردو زبان کے ساتھ کی جانے والی نا انصافی اور زیادتی کا احساس ہونے لگا ہے۔ "سٹیٹس مین" کے مسٹر کلدیپ نائر کے ساتھ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں وزیراعظم شریمتی گاندھی نے اِس بات کا کھُل کر اعتراف کیا ہے کہ آزادی کے بعد سے اُردو کے ساتھ شدید نا انصافی ہوئی ہے۔ اُردو کی ترویج کے لئے گجرال کمیٹی کا قیام غالباً اسی احساس کی پیداوار ہے۔ دراصل اِس مسئلے کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ اور وہ ہے یوپی میں ہونے والے اسمبلی انتخابات۔ ان انتخابات کے دوران چونکہ مسلمانوں نے اُردو کے ساتھ کی جانے والی نا انصافی کے خلاف احتجاج کے طور پر کانگریس کے خلاف ووٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے، اِس لئے حکمران جماعت کی طرف سے اُردو زبان بولنے والوں کو بہلانے کے لئے اُردو دوستی کا مظاہرہ ہونے لگا ہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ اگر اُردو کو اِس کا چھینا ہوا حق اور مرتبہ مِل جائے تو یہ ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں ایک بہت بڑا واقعہ ہوگا۔ افسوس اِس بات کا ہے

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کہ ہماری ریاست میں اُردو سرکاری زبان ہونے کے باوجود بے بس اور کسمپرسی کی حالت میں پڑی رہی اور بعض تنگ نظر اور کوتاہ اندیش اُردو اور کشمیری زبان کے درمیان ایک فرضی تصادم کا ماحول تیار کرنے میں مصروف رہے۔ ریاست کے حالیہ بجٹ اجلاس میں گورنر صاحب نے ریاست کی تاریخ میں پہلی بار اپنا خطبہ اُردو میں پڑھ کر ایک بہت عمدہ روایت قائم کی ہے اور اب وزیر خزانہ نے پہلی بار اُردو میں اپنی بجٹ تقریر پڑھ کر اِس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ توقع کی جانی چاہیئے کہ سید میر قاسم کی حکومت اُردو کے تئیں برتی گئی غفلت اور عدم توجہی کا کفارہ ادا کر کے اِسے اپنے منصب پر بحال کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ اُردو کی ترقی اور ترویج سے کِسی طور بھی کشمیری اور ڈوگری زبان کا مستقبل خطرے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اور حکومت کو اِن علاقائی زبانوں کی ترقی کے لئے پوری طرح کوشاں رہنا چاہیئے۔ اُردو کو ریاست میں لنگوا فرینکا کا درجہ حاصل ہے اور یہی زبان بیرونی دُنیا سے ہمارے رابطے کی زبان بن سکتی ہے۔ اُردو ایک زبان ہی نہیں ایک کلچر اور معاشرت کی نمائندہ ہے۔ اِس لئے جب تک یہ کلچر اور معاشرت قائم ہے اُردو کی اہمیت اور ضرورت باقی رہے گی۔

......☆......

(۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

عاشقانِ پاکستان کی خدمت میں

گزشتہ مہینے ''آزاد کشمیر'' کا دورہ کرتے ہوئے پاکستان کے وزیراعظم عزت مآب ذوالفقار علی بھٹو نے مسئلہ کشمیر اور کشمیری عوام کے ساتھ اپنی گہری دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کر کے کشمیر میں پاکستان کے عاشقوں اور ''پاکستانی جنت'' کے طلب گاروں میں ایک نئی اُمید اور نئی زندگی پیدا کر دی ہے جو لوگ سنگین حقائق اور کڑوے کسیلے تجربات کی روشنی میں کچھ تلخ اور ناگوار صداقتوں پر ایمان لا کر راضی بہ رضا تھے۔ وہ ایک بار پھر بے چین، بے قرار اور مضطرب نظر آ رہے ہیں۔ کشمیر میں کسی ایک جمعہ کو ہڑتال کرانے کی برمحل اور بروقت دھمکی دے کر پاکستانی وزیراعظم نے جہاں ہندوستان کے اربابِ اقتدار کی نیندیں حرام کر دی ہیں، وہاں پاکستان نواز معصوموں کو بھی نئے نئے خواب آنے لگے ہیں۔ اور وہ بوالہوس ستائیس سالہ پرانے تجربات کی ساری کڑواہٹ بھول کر اب یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ اب جلد ہی کشمیر پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔ انہیں یقین ہے کہ بھٹو صاحب کی اپیل پر ہڑتال ہو جانے کے دوسرے دن ہندوستان کشمیر سے اپنا بوریا بسترہ باندھ کر کشمیر کو پاکستانی وزیراعظم کے قدموں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں ڈال دے گا۔ اس غلط فہمی کا شکار، کچھ سیدھے سادے بھولے بھالے نوجوان ہی نہیں، کشمیر میں پاکستان نواز عناصر کے ''قائدِ اعظم'' میر واعظ مولوی محمد فاروق بھی ہیں کہ جنہوں نے بھٹو صاحب کی اپیل نشر ہونے سے پہلے ہی اس کا خیر مقدم کیا اور نوجوانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اس ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے فوراً سرگرم عمل ہو جائیں۔ فاروق صاحب کی اس بے صبری اور بیتابی نے بہت سے معصوموں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ شاید یہی ہڑتال ہندوستان سے نجات اور پاکستان سے الحاق کا بہانہ بن جائے، اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے 'پاکستانی' اب دن رات ریڈیو پاکستان اور آزاد کشمیر ریڈیو سے کان لگائے بیٹھے بھٹو صاحب کی اپیل کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے پاکستان کے ان عاشقوں، بھٹو صاحب کے ان چاہنے والوں اور جنتِ پاکستان کے ان طلب گاروں سے دلی ہمدردی ہے۔ میرا بس چلتا تو میں انتظار کے مارے ان بے قراروں کی خاطر کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنا کر ان کی خواہش پوری کر دیتا۔ کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جب تک پاکستان ایک ''خوب صورت خواب'' کی طرح انہیں للچاتا رہے، وہ ہندوستان کی کھردری حقیقت سے آسودہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ بات میرے دائرہ کار اور حدِ اختیار دونوں سے باہر ہے۔ اس لئے میں دلی ہمدردی کے باوجود ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ان کے جذبات کی حدت اور درد کی شدّت کو کم کرنے کا ایک اور طریقہ بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ انہیں دعویٰ اور دلیل کے ذریعے یہ سمجھایا جائے کہ پاکستان وہ نہیں ہے جو انہیں نظر آتا ہے۔ پاکستان کی حقیقت اس کے تصور سے بہت مختلف ہے۔ اور وہ لوگ جو پچھلے پچیس سالوں کے دوران

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

اس جنت کی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں، وہ اب پاکستان کے نام سے بھی بیزار ہیں۔ بنگلہ دیش کی آزادی، پاکستان میں موجودہ بے چینی "آزاد کشمیر" میں پاکستانی حکمرانوں کے خلاف سخت نفرت کا جذبہ، پاکستان میں مقیم کشمیریوں کی حالتِ زار اور اسی نوعیت کے تلخ حقائق کی نشان دہی کر کے انہیں یہ احساس دلایا جاسکتا تھا کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ میر واعظ مولوی یوسف شاہ اور غلام نبی گلکار کے تجربات اور تاثرات کا حوالہ دے کر ان کی آنکھوں سے اندھی محبت کا پردہ ہٹایا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنا ممکن نہیں کیونکہ پاکستان کے ان عاشقوں کی اکثریت تاریخ، حقائق، تجربات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ وہ اپنی آرزو کے غلام اور اپنی ہوس کے قیدی ہیں۔ انہیں حقیقت سے زیادہ اپنے خواب عزیز ہیں۔ اور ان کے لئے پاکستان کے نام میں جادو ہے۔ وہ دعویٰ سننے اور دلیل سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اسی لئے پچھلے ستائیس برس سے لکیر سے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ پاکستان کے عوام سے نہیں، وہاں کے حکمرانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ جب پاکستان میں صدر ایوب نے وہاں کے عوام پر ایک ناقابلِ برداشت فوجی آمریت مسلط کر کے انہیں اپنے تمام بنیادی حقوق سے محروم کر دیا تھا اور پاکستانی عوام اس فوجی ڈکیٹیٹر کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے تو کشمیر کے پاکستان نواز عناصر کی ہمدردیاں، پاکستانی عوام کی بجائے صدر ایواب کے ساتھ تھیں۔ اور صدر ایوب کے زوال کے غم میں اگر ابھی تک کسی کی آنکھیں اشکبار ہیں تو وہ اپنے ہاں کے پاکستان نواز دوست ہیں۔ پھر جب جنرل یحییٰ خان نے پاکستان کے سیاہ سفید کا مالک بن کر

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

وہاں کے عوام کی خواہشات کو کچلنا شروع کر دیا تو کشمیر کے ''پاکستانیوں'' نے اسے اپنا ہیرو بنالیا۔ اور جوں جوں وہ پاکستانی عوام کی نظروں میں ذلیل اور خوار ہوتا گیا، کشمیر کے پاکستانی حلقوں میں اس کا وقار اور اعتبار بڑھتا گیا۔ جنرل یحییٰ خان کے بعد اب بھٹو صاحب پاکستان کے تخت پر بیٹھے ہیں، تو کشمیر میں پاکستان کے عاشقوں نے انہیں اپنا رہبر اور رہنما تسلیم کرلیا ہے۔ کشمیر کے پاکستانیوں کی اسی مریضانہ حکمران پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے دو سال قبل وزیر اعظم بھٹو کے موجودہ مشیر محمد یوسف بچھ نے چراغ بیگ کو نیویارک میں ایک ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ پاکستان کے عوام کشمیری مسلمانوں کے اس رویے پر حیران بھی ہیں، اور پریشان بھی۔ بہر کیف، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں کہہ یہ رہا تھا کہ کشمیر کے پاکستانی مریضوں کا عقل استدلال اور حقائق کی ''ادویات'' سے رو بہ صحت ہونا مشکل ہے۔ وہ اپنے جذبات اور توہمات کے طلسم میں اسیر ہیں اور ان کے خیال میں پاکستان اور اسلام دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ دنیا بھر کے سقراط اور بقراط، حکیم اور ڈاکٹر، ان کی نفسیات تبدیل نہیں کر سکتے۔ اور جب تک آسمان پر چاند اور ستارے قائم ہیں، ان کے دلوں میں پاکستان کی محبت اور پاکستانی حکمرانوں کی عقیدت کے چراغ روشن رہیں گے۔ اور اسی لئے مجھے ان پر غصہ آنے کی بجائے ان سے ہمدردی ہے، یہ لوگ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہیں انہیں سرحد کے اس پار دودھ کی نہریں اور شہد کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور انہیں یقین ہے کہ سبز ہلالی پرچم کو دیکھتے ہی ان کے سارے دکھ درد رفع ہو جائیں گے۔ بدقسمتی سے ان قسم کے عاشقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہماری ریاست

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

میں موجود ہے۔ اور میر واعظ مولوی محمد فاروق ایسے ہی مجبوروں اور معصوموں کی نفسیات سے فائدہ اٹھا کر اپنی سیاست اور قیادت کا علم بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان کی حسرتوں اور آرزوؤں کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے نیلام کر کے خود بمبئی کے تاج محل ہوٹل اور ''بلیو نائل'' میں دادِ عیش دیتے ہیں اور غریب مسلمانوں کو قربانی، ایثار اور جدوجہد کا درس دیتے ہیں۔ میں پاکستان کے ان معصوم عاشقوں اور میر واعظ صاحب کے مظلوم پیروکاروں سے یہ نہیں کہوں گا کہ وہ اپنی محبت، اپنے مؤقف، اپنی منزل اور اپنے نصب العین سے دست بردار ہو جائیں۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہوں گا کہ وہ مسٹر بھٹو کو اپنا رہبر تسلیم نہ کریں، لیکن ان کی خدمت میں دو ایک باتیں گزارش کرنا چاہوں گا کہ وہ فرصت کے لمحات میں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا بہت مشکل ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اگر پاکستان آئندہ دس برسوں میں اتنا طاقتور، مضبوط اور مستحکم بن جائے کہ وہ ہندوستان کو ہر محاذ پر شکست دے کر اسے اتنا کمزور کر دے کہ ہندوستان پاکستان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے، تو کشمیر کا پاکستان کے ساتھ مل جانا یقینی بن جائے گا۔ اگر ہندوستان میں اندرونی طور اتنی زبردست اتھل پتھل پیدا ہو کہ ہندوستان کا شیرازہ بکھر جائے اور ملک کے ہر حصے پر مرکز کی گرفت اتنی ڈھیلی پڑ جائے کہ ہر ریاست اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر سکے، تو کشمیر کے لئے پاکستان کے ساتھ شمولیت کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ یہی دو صورتیں ہیں کہ جن کے وجود میں آنے سے آپ لوگوں کے خواب، آپکی خواہشات اور آپ کی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

تمنائیں پوری ہوسکتی ہیں۔لیکن آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ موجودہ صورت حال میں اس قسم کے امکانات نظر نہیں آتے، اس لئے آپ کو جب تک انتظار کرنا پڑے گا، کہ اس قسم کے حالات رونما ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ہڑتالوں، آپ کے پتھراؤ اور آپ کی زوردار تقریروں سے موجودہ صورت حال میں کسی قسم کے تغیر یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور اس قسم کی سرگرمیوں سے یقیناً پاکستان سے الحاق کا راستہ ہموار نہیں ہوگا۔ کشمیر کے لئے ابھی تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تین جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ اور ہر جنگ کے بعد پاکستان کے لئے کشمیر حاصل کرنے کے امکانات تاریک سے تاریک تر ہوتے گئے ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں جو مسئلہ خوفناک جنگوں کے بعد بھی حل نہ ہوسکا، وہ ہڑتال، پتھراؤ اور ٹکراؤ کے ذریعے حل نہیں ہوسکے گا۔ میں اپنے پاکستانی دوستوں کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا، وہ چاہیں تو اپنی جدوجہد جاری رکھ سکتے ہیں اور اگر ان میں دم خم ہے تو انہیں ہندوستان کی فوجی طاقت سے ٹکر لے کر اپنے ''ملک'' کو ''آزاد'' کرانے کی کوششیں جاری رکھنا چاہئیں۔ لیکن میں انہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ جتنا وہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں یہ کام پاکستان کے حکمرانوں پر چھوڑ دینا چاہیئے، کہ وہ امریکہ، ایران، جاپان، جہاں سے بھی ممکن ہو، اسلحہ حاصل کر کے ہندوستان کو ہر محاذ پر شکست دینے کی کوشش کریں، اور اس طرح کشمیر جنت نظیر کو پاکستان کا حصہ بنادیں۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ کشمیر صرف پاکستان کے لئے ہی نہیں، ہندوستان کے لئے بھی وقار کا سوال ہے۔ مسٹر بھٹو کشمیر میں

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

ہڑتال کرا سکتے ہیں، لیکن اس طرح وہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ نہیں بنا سکتے۔ مجھے امید ہے کہ میرے معصوم اور مخلص پاکستانی دوست ان باتوں پر غور کریں گے۔

......☆......

(۷/دسمبر ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

جائیدادِ مہاجرین کے غاصب

پنجاب میں ہر چند کمیٹی کے انکشافات نے وہاں کی سیاست اور حکومت میں ایک ایسی اتھل پتھل پیدا کر رہی ہے کہ گیانی ذیل سنگھ کی وزارت کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا ہے۔ ریاستی اسمبلی کے اسپیکر، کئی وزیر، نائب وزیر اور حکمران جماعت کے کچھ سرکردہ لیڈر کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے ''تابدار'' چہرے ہمیشہ کے لئے داغدار ہو گئے ہیں۔ یہ کمیٹی جو حکومت پنجاب نے ۴ر جون ۱۹۷۲ء کو نامزد کی تھی، ریاستی اسمبلی کے ۸ ممبران پر مشتمل تھی، اور اس کو مہاجرین کی متروکہ زرعی زمین کے سلسلے میں مبینہ بے ضابطگیوں کا جائزہ لینے کا کام سپرد ہوا تھا۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کئی وزیروں، سابق وزیروں، ممبرانِ پارلیمنٹ، ممبران اسمبلی، آئی اے ایس اور آئی پی ایس افسروں کے علاوہ درجنوں سیاسی لیڈروں کے متعلق یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ، انہوں نے اپنے اقتدار اور منصب کا ناجائز استعمال کر کے، ہزاروں ایکٹر متروکہ زمین پر اپنا قبضہ جمایا ہے اور اس طرح جو زمین مرکزی حکومت کی طرف سے ہریجنوں میں تقسیم کرنے کے لئے ریاستی حکومت کو دی گئی تھی، اُسے بددیانت حاکموں اور سیاست دانوں نے آپس میں بانٹ کھایا۔

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رشوت ستانی، کنبہ پروری، بے ایمانی، اور بد دیانتی کے معاملہ میں اگرچہ پنجاب ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں دوقدم آگے ہے لیکن ہر چند کمیٹی کی رپورٹ نے پنجاب میں ہی نہیں، پورے ملک میں ایک ایسا ہیجان بپا کر دیا، کہ حکمران جماعت کے لئے اسے نظر انداز کرنا ناممکن بن گیا، پنجاب کے وزیر زراعت کیپٹن رتن سنگھ اور اسمبلی کے اسپیکر شری دربارہ سنگھ کو بادلِ ناخواستہ اپنے عہدوں سے مستعفی ہونا پڑا۔ ایک کہا یہ ریاست میں جائدادِ مہاجرین کی لوٹ کھسوٹ کے سلسلے میں جو حقائق منظرِ عام پر آئے ہیں اُن سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مہاجروں کی جائداد کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنے والے اکثر لُٹیرے حکمران جماعت اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پنجاب ہی کی طرح ہماری ریاست جموں وکشمیر میں بھی جائدادِ مہاجرین کی لوٹ کھسوٹ کا جائزہ لینے کیلئے ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی قائم کی جانا چاہیئے کہ جو اس بات کی تحقیقات کرے کہ، ۱۹۴۷ء سے اب تک مہاجروں کی جائداد کو کس بے دردی کے ساتھ لوٹا گیا ہے اور کس کس طرح بارسوخ لوگوں نے اسے مالِ مفت سمجھ کر اپنے تصرّف میں لایا ہے، میں نے ہر چند کمیٹی کے قیام سے بہت پہلے اس اخبار ۲۳/ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ''جائداد مہاجرین کی لوٹ'' کے عنوان سے ایک اداریے میں ان بے ضابطگیوں اور دھاندلیوں کی طرف ریاستی حکومت کی توجہ مبذول کی تھی، کہ جو جائداد مہاجرین کے انتظام، اس کی دیکھ بھال، الاٹمنٹ اور تقسیم کے سلسلے میں روا رکھی گئی ہیں۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا، اس لئے میری آواز صدا بہ صحر ثابت ہوگئی، اب جب کہ پنجاب میں ہر چند کمیٹی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

نے متروکہ زمین کے سلسلے میں حکمرانوں کی بے راہ رویوں کا پردہ چاک کیا ہے، ریاستی حکومت کو اس قسم کی چھان بین میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے اور میرا دعویٰ ہے کہ اگر ریاست جموں وکشمیر میں جائیداد مہاجرین کی لوٹ کا جائزہ لینے کے لئے ایک اعلیٰ سطح کی غیر سرکاری کمیٹی قائم کی جائے، تو پنجاب کا اسکینڈل پھیکا پڑ جائے گا۔ اور ساری دنیا پر یہ بات واضح ہو جائے گی، کہ ''کشمیر اس میدان میں بھی سارے ملک کی ''رہ نمائی'' کر سکتا ہے۔''

جموں وکشمیر میں مہاجرین کی حیثیت اور جائداد مہاجرین کی نوعیت پنجاب اور دوسری ریاستوں کے مقابلے میں مختلف ہے۔ ریاست پر ۱۹۴۷ء کے قبائلی حملے نے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لی، تو لاکھوں ریاستی باشندے پاکستان اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں پھنس گئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بندی کے معاہدے نے ریاست کو عملاً دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور جموں اور کشمیر کے لاکھوں لوگ جنگ بندی سرحد کے اس پار رہ گئے جو پچھلے ۲۷ برسوں سے اپنے وطن لوٹنے کے لئے بیقرار اور مضطرب ہیں۔ ان میں سے ۹۰٪ ایسے مہاجر ہیں کہ جو حالات کی ستم ظریفی اور اغیار کے جبر و استبلاد کا شکار ہو کر وطن سے بے وطن ہو گئے اور جنہیں اپنی مرضی، منشاء، رغبت اور رضا کے خلاف اپنے گھر بار، عزیز و اقارب اور اپنا مال و متاع چھوڑنے نے مجبور کر دیا گیا۔ لیکن جو کبھی دیارِ غیر کو اپنا گھر سمجھنے پر آمادہ نہ ہو سکے اور جو آج بھی اس انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ کبھی نہ کبھی آہنی دیوریں پگھل جائیں گی۔ اور وہ اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔۔۔ ان ہی بدنصیبوں، مجبوروں اور ستم

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رسیدوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے اس ریاست میں قانونِ جائداد مہاجرین کے تحت محکمۂ جائداد مہاجرین قائم ہوا تھا۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے، کہ اس محکمے کی، بدولت، گزشتہ پچیس چھبیس برسوں میں کروڑوں روپے کی مالیت کی آراشی، عمارات، باغات اور ساز و سامان، غاصبوں اور لٹیروں کے تصرّف میں آگیا اور اس طرح محافظوں نے رہزن بن کر اس لوٹ کھسوٹ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نتیجہ یہ کہ ہزاروں ایکڑ زمین، عالیشان مکانات اور بڑی بڑی حویلیاں، وسیع باغات اور کروڑوں روپے کا ساز و سامان، ایسے بارسوخ لوگوں کے قبضے میں ہے کہ جن کا نہ اس پر کوئی قانونی استحقاق ہے اور نہ اخلاقی جواز، تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ لاکھوں روپے کی جائیدادیں محکمۂ مہاجرین کے رجسٹروں سے خارج کر کے بیچ دی گئی ہیں اور جہاں لوٹ مار کا یہ طریقہ ممکن نہیں ہو سکا ہے وہاں ہزاروں روپے ماہوار کرایہ حاصل کرنے والے مکانات اور باغات کو تیس تیس، چالیس چالیس روپے ماہوار کرایے پر اٹھا دیا گیا ہے۔ مہاجرین کے بہت سے فرضی اور غیر مستحق رشتے داروں نے موقع غنیمت جان کر بڑی بڑی جائیدادوں پر قبضہ جما لیا ہے اور اگر کبھی کوئی بھولا بھسرا مہاجر ہزاروں مصیبتیں اٹھا کر گھر لوٹنے میں کامیاب ہو جائے تو یہی خون کے رشتے دار اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور جب تک ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر کے اُسے یہاں سے بھگا نہیں چھیتے چین سے نہیں بیٹھتے، مجھے ذاتی طور پر .... ایسے واقعات کا علم ہے کہ جہاں سگھے بھائیوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کے خلاف (جو بیس سال کے بعد صرف چند ماہ کے لئے گھر لوٹے تھے) پولیس میں یہ

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رپورٹ درج کرائی کہ یہ پاکستانی جاسوس ہیں اور ان کو فوراً ریاست بدر کر دینا چاہیئے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ بلاشرکت غیرے اپنے مہاجر بھائیوں کی جائداد پر اپنا تصرّف اور تسلط قائم رکھیں۔ اسی طرح کچھ بری عالیشان عمارتیں حکومت کے قبضے میں ہیں اور اس کا برائے نام کرایہ مقرر کر کے بے چاروں مہاجروں کی بدقسمتی کا مذاق اُڑا لیا ہے۔ بارسوخ سرکاری افسروں اور با اثر سرمایہ داروں نے محکمۂ جائداد مہاجرین کے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں کے ساتھ مل کر فرضی دستاویزوں اور جھوٹی شہادتوں کے بل بوتے پر اپنے نام بڑے بڑے محل اور باغات الاٹ کرائے ہیں۔ کچھ پاجیوں نے جھوٹے حلف نامے داخل کر کے مہاجروں کی زمینیں اور جائدادیں اپنے نام واگزار کرا کر ان کو بیچ دیا ہے تا کہ اگر بے چارا مہاجر کبھی وطن لوٹ آنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہاں آ کر کفِ افسوس ہی ملتا رہے۔ غرض گزشتہ بیس پچیس برسوں کے دوران غاصبوں نے بدقسمت مہاجروں کی جائدادوں کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹا ہے اور .... سے زائد مکانات، باغات، زرعی زمین اور دکانات ان لوگوں کے قبضے میں ہیں کہ جن کا قانونی طور ان پر کوئی استحقاق نہیں ہے اور جو کچھ محکمۂ کسٹوڈین کی تحویل میں ہے اس کی دیکھ بھال میں بڑی بے دردی، لاپرواہی اور غیر ذمہ داری برتی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں صوبہ جموں کا ذکر خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ جہاں مہاجروں کی کروڑوں روپے کی جائداد کو با اثر اور بارسوخ لوگوں نے باپ دادا کی میراث سمجھ کر بانٹ لیا ہے۔ ان جائدادوں کو پُر اسرار طریقے سے محکمہ کسٹوڈین کے رجسٹروں سے خارج کر کے باقاعدہ اپنی ملکیت قرار دیا گیا ہے اور جہاں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوا، وہاں بڑی بڑی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

حویلیوں کا بیس تیس روپیہ کرایہ مقرر کر کے انہیں مستقل طور اپنے نام الاٹ کروایا گیا ہے، زرعی زمینوں اور باغات کے ساتھ بھی یہی عمل روا رکھا گیا اور نتیجہ یہ کہ جموں کے مہاجروں کی ساٹھ فیصد سے زیادہ جائداد محکمہ کسٹوڈین کی بجائے سرکاری غاصبوں اور سیاسی رہزنوں کی تحویل میں ہے، جموں شہر سے بالخصوص اور صوبہ جموں سے بالعموم مسلمانوں کو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران جس بے سروسامانی کی حالت میں ہجرت کرنا پڑی، اس کے نتیجہ میں ہزاروں مکانات، دکانیں، تجارتی ادارے اور لاکھوں ایکٹر زرعی زمین اصل مالکوں کے ہاتھوں سے نکل کر غاصبوں کے قبضے میں آ گئے۔ اور اس افراتفری میں جو جس کے ہاتھ لگا، وہ اس کا مالک بن بیٹھا، بجائے اس کے کہ حکومت اس قبضۂ جابرانہ اور لوٹ کھسوٹ کا سدِّ باب کر کے مہاجرین کی جائداد کو ایک مقدس امانت کے طور پر محفوظ رکھنے کا فرض انجام دے وہ خود اس لوٹ مار میں شریک ہو گئی اور جہاں جہاں بددیانت لوگوں کو اس مالِ یتیم پر تسلّط جمانے میں مشکل آ گئی۔ حکومت نے طاقت اور قانون کا سہارا لے کر اس مشکل کو حل کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ جموں شہر میں محکمہ جائداد مہاجرین تو ہے لیکن جائیداد مہاجرین نہیں ہے۔ اور جو کچھ اس نام پر موجود ہے وہ اصل جائداد کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

جموں اور کشمیر میں جائیداد مہاجرین کی دیکھ بھال، اس کے تحفظ اور اس سے ہونے والی آمدن کو مہاجرین کے نام پر جمع کرنیکا قانون تو موجود ہے، لیکن گزشتہ ۲۷ برس کی تاریخ اور تجربہ گواہ ہے کہ اس قانون کو جائیداد مہاجرین کے استحکام کی بجائے اس کے استحصال کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور چونکہ مہاجرین

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

رپورٹ درج کرائی کہ یہ پاکستانی جاسوس ہیں اور ان کو فوراً ریاست بدر کر دینا چاہیئے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ بلاشرکت غیرے اپنے مہاجر بھائیوں کی جائداد پر اپنا تصرّف اور تسلط قائم رکھیں۔ اسی طرح کچھ بری عالیشان عمارتیں حکومت کے قبضے میں ہیں اور اس کا برائے نام کرایہ مقرر کر کے بے چاروں مہاجروں کی بدقسمتی کا مذاق اُڑا لیا ہے۔ بارسوخ سرکاری افسروں اور با اثر سرمایہ داروں نے محکمۂ جائداد مہاجرین کے اعلیٰ اور ادنیٰ افسروں کے ساتھ مل کر فرضی دستاویزوں اور جھوٹی شہادتوں کے بل بوتے پر اپنے نام بڑے بڑے محل اور باغات الاٹ کرائے ہیں۔ کچھ پاجیوں نے جھوٹے حلف نامے داخل کر کے مہاجروں کی زمینیں اور جائدادیں اپنے نام واگزار کرا کران کو بیچ دیا ہے تا کہ اگر بے چارا مہاجر کبھی وطن لوٹ آنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہاں آ کر کفِ افسوس ہی ملتا رہے۔ غرض گزشتہ بیس پچیس برسوں کے دوران غاصبوں نے بدقسمت مہاجروں کی جائدادوں کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹا ہے اور .... سے زائد مکانات، باغات، زرعی زمین اور دکانات ان لوگوں کے قبضے میں ہیں کہ جن کا قانونی طور ان پر کوئی استحقاق نہیں ہے اور جو کچھ محکمۂ کسٹوڈین کی تحویل میں ہے اس کی دیکھ بھال میں بڑی بے دردی، لاپرواہی اور غیر ذمہ داری برتی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں صوبہ جموں کا ذکر خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ جہاں مہاجروں کی کروڑوں روپے کی جائداد کو با اثر اور بارسوخ لوگوں نے باپ دادا کی میراث سمجھ کر بانٹ لیا ہے۔ ان جائدادوں کو پُر اسرار طریقے سے محکمہ کسٹوڈین کے رجسٹروں سے خارج کر کے باقاعدہ اپنی ملکیت قرار دیا گیا ہے اور جہاں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوا، وہاں بڑی بڑی

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

حویلیوں کا بیس تیس روپیہ کرایہ مقرر کر کے انہیں مستقل طور اپنے نام الاٹ کروایا گیا ہے، زرعی زمینوں اور باغات کے ساتھ بھی یہی عمل روا رکھا گیا اور نتیجہ یہ کہ جموں کے مہاجروں کی ساٹھ فیصد سے زیادہ جائداد محکمہ کسٹوڈین کی بجائے سرکاری غاصبوں اور سیاسی رہزنوں کی تحویل میں ہے، جموں شہر سے بالخصوص اور صوبہ جموں سے بالعموم مسلمانوں کو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران جس بے سروسامانی کی حالت میں ہجرت کرنا پڑی، اس کے نتیجہ میں ہزاروں مکانات، دکانیں، تجارتی ادارے اور لاکھوں ایکڑ زرعی زمین اصل مالکوں کے ہاتھوں سے نکل کر غاصبوں کے قبضے میں آ گئے۔ اور اس افراتفری میں جو جس کے ہاتھ لگا، وہ اس کا مالک بن بیٹھا، بجائے اس کے کہ حکومت اس قبضۂ جابرانہ اور لوٹ کھسوٹ کا سدِ باب کر کے مہاجرین کی جائداد کو ایک مقدس امانت کے طور پر محفوظ رکھنے کا فرض انجام دے وہ خود اس لوٹ مار میں شریک ہو گئی اور جہاں جہاں بد دیانت لوگوں کو اس مالِ یتیم پر تسلّط جمانے میں مشکل آ گئی۔ حکومت نے طاقت اور قانون کا سہارا لے کر اس مشکل کو حل کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ جموں شہر میں محکمہ جائداد مہاجرین تو ہے لیکن جائیداد مہاجرین نہیں ہے۔ اور جو کچھ اس نام پر موجود ہے وہ اصل جائداد کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

جموں اور کشمیر میں جائیداد مہاجرین کی دیکھ بھال، اس کے تحفظ اور اس سے ہونے والی آمدن کو مہاجرین کے نام پر جمع کرنیکا قانون تو موجود ہے، لیکن گزشتہ ۲۷ برس کی تاریخ اور تجربہ گواہ ہے کہ اس قانون کو جائیداد مہاجرین کے استحکام کی بجائے اس کے استحصال کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور چونکہ مہاجرین

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

کی طرف سے، محکمہ کسٹوڈین ہی کو مختارِ کل بنا دیا گیا ہے، اس لئے اس محکمے کے اربابِ اقتدار و اختیار کو جو کچھ مرغوب تھا، وہی قانون قرار پایا۔ دیوانی عدالتوں کو چونکہ جائیداد مہاجرین کے سلسلے میں کسی قسم کی مداخلت کا حق حاصل نہیں، اس لئے محکمہ کسٹوڈین خود ہی ملزم، منصف اور گواہ قرار دیا پایا۔ اس قسم کے ''انصاف'' میں جتنی بدعنوانیاں اور بدمعاشیاں ممکن ہو سکتی تھیں۔ ان سب کا نمونہ اس محکمے کی کارگزاری میں ملے گا۔ اس جائیداد کے تحفظ کے لئے ریاستی حکومت پر جو قانونی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، حکومت اسے نبھانے میں قطعی طور پر ناکام ہوئی ہے۔ ''آزاد کشمیر'' کا علاقہ جہاں اس ریاست کے اکثر مہاجر آباد ہیں، آئینی، قانونی اور اخلاقی طور سے ہماری ہی ریاست کا حصہ ہے۔ اور اس لحاظ سے وہاں پھنسے ہوئے لوگ ہماری ہی ریاست کے باشندے ہیں۔ ان حالات میں جو حکومت اپنے شہریوں کی جائیداد کو خرد برد اور خیانت سے محفوظ رکھنے میں ناکام رہی ہو اسے برسرِ اقتدار رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اب جبکہ پنجاب کی حکومت نے ہر چند کمیٹی کی شکل میں ایک بہت اچھی اور قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے۔ میں وزیرِ اعلیٰ سیّد میر قاسم سے گزارش کروں گا کہ وہ جموں و کشمیر میں جائیداد مہاجرین پر غاصبانہ قبضے کی شکایات کا جائزہ لینے کے لئے ایک اعلیٰ اختیار والی کمیٹی قائم کریں۔ تاکہ اس قومی امانت کا تحفظ کرنے میں مزید تاخیر نہ ہو اور دُنیا کو پتہ چلے کہ امانت میں خیانت کے اس عمل میں اس ریاست نے کہاں تک ملک کی ''رہ نمائی'' کی ہے۔

......☆......

(اکتوبر ۱۹۷۳ء)

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

AINA NUMA

Collected Essays of Shamim Ahmed Shamim

Edition: 2025

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE

Digitized by eGangotri and Sarayu Trust.

AINA NUMA

Collected Essays of
Shamim Ahmed Shamim

Edition: 2025

CC-0. In Public Domain. Funding by IKS-MoE